

MARCH 2015

مارچ ۲۰۱۵ء



خبر و نظر

Khabr
Nazal

U.S. EMBASSY MAGAZINE
NEWS & VIEWS

ذرائع ابلاغ میں
خواتین

WOMEN IN
MEDIA





find US ON



www.twitter.com/
usembassyislamabad



www.facebook.com/
pakistanusembassy



www.flickr.com/photos/
'usembassyapk



www.youtube.com/user/
usembassyislamabad



Editor-in-Chief

Angela Aggeler - Counselor for Public Affairs

Managing Editor

Cynthia Harvey - Embassy Spokesperson

Associate Editor

Kedenard Raymond - Assistant Information Officer

Contacting Us

Khabr-o-Nazar, Public Affairs Section
US. Embassy, Ramna 5, Diplomatic Enclave Islamabad, Pakistan

Background

Khabr-o-Nazar is a free magazine published by the US. Embassy, Islamabad.
The magazine is designed and printed by Black Box Concepts.

Change of Address and Subscriptions

Send change of addresses and subscription requests to infoisb@state.gov

Letters to the Editor

Letters should not exceed 250 words and should include the writer's name, address, and daytime phone number. All letters become the property of Khabr-o-Nazar. Letters will be edited for length, accuracy, and clarity.

Stay Connected

Khabr-o-Nazar News & Views

Email: infoisb@state.gov

Phone: +92 (0) 51 208 0000 | Fax: +92 (0) 51 227 8040

http://islamabad.usembassy.gov/pakistan/khabr_o_nazar.html

Website: <http://islamabad.usembassy.gov>

ایڈیٹر ان چیف: اسٹیلا ایگلر، ٹونسلر برائے پبلک افیئرز

منیجنگ ایڈیٹر: سلٹھیہا ہاروے، ترجمان سفارتخانہ

ایسوسی ایٹ ایڈیٹر: کیڈینارڈ ریمنڈ، معاون انفارمیشن آفیسر

رابطے کا پتہ: خبر و نظر، پبلک افیئرز سیکشن، امریکی ایسٹسی، رمنا 5، ڈیپلومیٹک انکلیو، اسلام آباد، پاکستان

بیک گراؤنڈ: خبر و نظر امریکی سفارتخانہ اسلام آباد کی طرف سے شائع کردہ ایک بلا قیمت میگزین ہے۔

میگزین کو بلیک باکس کانسپٹس نے ڈیزائن کیا۔

پتہ کی تبدیلی اور اپنے نام جاری کرانے: پتہ کی تبدیلی اور سبسکرپشن کی درخواستیں infoisb@state.gov کو ارسال کیجئے۔

ایڈیٹر کے نام خطوط: خطوط کا متن 250 الفاظ سے زائد نہ ہو، اور اس میں لکھنے والے کا نام، پتہ اور دن کے اوقات کا ٹیلیفون نمبر درج ہوں۔ تمام

خطوط خبر و نظر کی ملکیت سمجھے جائیں گے اور ان کے متن میں اختصار، ضروری تصحیح اور مفہوم کو واضح کرنے کے مقصد سے اصلاح کی جاسکتی گی۔

رابطہ رکھئے: خبر و نظر نیوز اینڈ ویوز

ای میل: infoisb@state.gov

فون: +92 (0) 51 208 0000

http://islamabad.usembassy.gov/pakistan/khabr_o_nazar.html

ویب سائٹ: <http://islamabad.usembassy.gov>

ON THE COVER

Dickey Chapelle was the first female war correspondent to be killed in Vietnam, as well as the first American female reporter to be killed in action.



سرورق

ڈیکی چیپل ویتنام میں ہلاک ہونے والی پہلی خاتون جنگی نامہ نگار تھیں۔ اس کے علاوہ وہ پہلی امریکی خاتون صحافی تھیں جو دوران جنگ ہلاک ہوئیں۔

05	Editor's Corner by Cynthia Harvey	گوشہ مدیر
06	Supporting Press Freedom by Secretary Of State John Kerry	آزادی صحافت کی حمایت
08	At the Podium: U.S. Department Of State Spokesperson Jen Psaki	مرکز نگاہ: امریکی محکمہ خارجہ کی ترجمان جین ساسکی
10	Journalism is a Way of Life by Asma Shirazi	صحافت ایک طرز زندگی ہے
12	Never Stop Learning: Interview With Janel Knight	کبھی بھی سیکھنے سے گریز نہ کریں جینل نائٹ سے انٹرویو
14	Giving Our Children Mentors and Heroes: Interview with Sharmeen Obaid	ہم بچوں کی ہیرو اور تالیق دے رہے ہیں
17	Learning by Doing: Interview with Tala Hadavi	کام کر کے سیکھیں: طلحہ ہداوی سے انٹرویو
20	Women are Equal, and Sometimes, Even Better by Ann Hartman	خواتین برابر ہیں، ایسا وقت تو بہتر ہوتی ہیں
22	Sports Journalist – Fatima Saleem	سپورٹس جرنلسٹ: فاطمہ سلیم
24	The Freedom to Share Thoughts & Opinions: Interview with France Francois	خیالات و آرا کا تبادلہ کرنے کی آزادی
26	Media Snapshot: Alumnae in Media	پاکستانی ذرائع ابلاغ میں امریکی تبادلہ پروگراموں کی سابقہ طالبات
30	Raising Awareness to Move Forward by Huma Chaudhry	آگے بڑھنے کیلئے شعور کی بیداری
31	Holding on to These Ordinary Days by Charlie Grosso	یہ عام روز و شب
33	My Post-Feminist View on the Representation of Women in Media by Dr. Rakhshinda Perveen	ذرائع ابلاغ میں خواتین کی نمائندگی کے حوالے سے تحریک
34	New York, Beyond the City by Kris Clark	نیویارک شہر سے پرے
36	Media Snapshot: New York's Female Bloggers & Takeover of Fashion Media by Kelia Cummins	نیویارک کی خواتین بلاگز اور فیشن کی دنیا پر ان کی حکمرانی
37	Profile: Oprah Winfrey	تعارف اوپرا وینفرے
38	Raising Our Voices, Demanding Representation and Standing Strong by Myra Imran	اپنی آواز اٹھاتے ہوئے: نمائندگی کا مطالبہ کرتے ہوئے ہم ایک ہیں
40	Interview with Elizabeth Thorp	الیزبتھ تھورپ
42	Toward The Frontlines by Shehla Rizwan	محاذوں کی طرف رواں دواں
43	Don't Wait for Anyone's Permission: Interview With Charla Lauriston	کسی کی اجازت کا انتظار نہ کریں۔
45	Giving a Voice to the Voiceless: Interview with Sadia Shah	بے زبانوں کی ترجمانی کرنا

Editor's corner

گوشہ مدیر



Dear Readers,

This edition of Khabr o Nazar is near to our hearts. Kedenard Raymond, the Associate Editor, and I work in the Press Section of the U.S. Embassy in Islamabad, and we are constantly impressed by the amazing women journalists we meet through our work here in Pakistan. We see their strident efforts to report the truth and inform the public, and we also see some of the many challenges they face. As Americans, we also see that many of the challenges they experience here also exist in the United States and around the world. In sharing in these struggles, Pakistani journalists join women all over the world who are shattering the proverbial "glass ceiling." They are persevering and in this edition of Khabr o Nazar, they will tell you their stories.

We hope you will enjoy this opportunity to gain a glimpse into the lives of American and Pakistani women in media, who represent a fascinating range of perspectives, lifestyles, and careers. In their own words, these women will tell you how rewarding it is amplify the voices of the public, or how important it is to document and highlight stories that for one reason or another, are below the radar. We talk to sportscasters, anchorwomen, and staff reporters who are constantly in the public eye and working tirelessly every day to be the best at their craft. We also get the behind-the-scenes scoop from photographers, editors, and the Joint Secretary at the National Press Club here in Pakistan. We are extremely lucky to have featured Asma Shirazi, winner of the 2014 Peter Mackler Award for Courageous and Ethical Journalism.

In this edition, we also feature the East-West Center, a partner of the U.S. Embassy in Islamabad that offers an amazing exchange program to help Pakistani journalists hone their skills. This highlights an important element of the U.S. Mission's work here in Pakistan: training. Working in partnership with media outlets, educational institutions, and non-governmental organizations, we provide Pakistani journalists with training in best journalistic practices, as well as opportunities to conduct reporting tours in the U.S. and elsewhere on topics of interest in politics, the arts, military, and education.

Finally, we will also hear from Secretary Kerry, who expounds on how important free press and free expression are to a democracy, and how the U.S. State Department is supporting these values around the world.

It has been a wonderful journey editing this issue and hopefully, these stories inspire you as well. Give us your thoughts and tell us what you'd like to see in the future. We look forward to hearing from you! ■

Sincerely,

Cynthia R. Harvey

Cynthia Harvey

Managing Editor and Embassy Spokesperson
U.S. Embassy

Email: infoisb@state.gov | Website: <http://islamabad.usembassy.gov>

قارئین کرام

خبر و نظر کا یہ شمارہ ہمارے دلوں کے بہت قریب ہے۔ ایسوسی ایٹ ایڈیٹر کیڈ نارڈ ریمنڈ اور میں اسلام آباد کے امریکی سفارت خانہ کے پریس سیکشن میں کام کرتی ہیں اور ہم اپنے کام کے دوران میں حیران کن خواتین صحافیوں سے ملنے پر ہمیشہ متاثر ہوتی ہیں۔ ہم انہیں سچی خبریں دینے اور عوام کو معلومات بہم پہنچانے کے لئے انتہائی کوشش کرتے دیکھتی ہیں۔ ہمیں انہیں درپیش بہت سے چیلنجز کا بھی علم ہے۔ امریکی ہونے کے ناطے ہمیں یہ معلوم ہے کہ انہیں درپیش بہت سے چیلنجز امریکہ اور دنیا کے دیگر ممالک میں بھی پائے جاتے ہیں۔ دنیا بھر کی دوسری خواتین کی طرح پاکستانی صحافی بھی اپنی ترقی پر عائد غیر مرئی پابندیوں کو توڑنے کی جدوجہد کر رہی ہیں۔ خبر و نظر کے اس شمارے میں آپ ان ثابت قدم خواتین صحافیوں کی کہانیاں پڑھیں گے۔

ہمیں اُمید ہے کہ آپ ذرائع ابلاغ سے منسلک ان پاکستانی اور امریکی خواتین کی زندگیوں کی کچھ جھلکیوں کو دیکھنے کے اس موقع سے بہت لطف اندوز ہوں گے جو طرز زندگی، اور کیریئر کے اعتبار سے انتہائی متاثر کن پس منظر کی حامل ہیں۔ یہ خواتین اپنی زبانی آپ کو بتائیں گی کہ لوگوں کی آواز اگے پہنچانا کس قدر اطمینان بخش ہوتا ہے یا یہ کہ عام نظروں سے پوشیدہ کہانیوں کے مختلف گوشوں کو منظر عام پر لا کر آج کرنا کتنا اہم کام ہے۔ ہم نے کھلیوں کی خبریں دینے والیوں، میزبان خواتین اور سٹاف رپورٹرز سے بات کی ہے جو ہر وقت عوام کی نظروں میں رہتی اور روزانہ اپنے کام کو بہتر سے بہتر انداز میں کرنے کے لئے ان تھک محنت کرتی ہیں۔ ہم نے یہاں میں پس منظر میں رہنے والی فونو گرافوں، ایڈیٹرز اور نیشنل پریس کلب پاکستان کی جوائنٹ سکریٹری سے بھی بات کی ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم 2014ء کا "Peter Mackler Award for Courage and Ethical Journalism" جیتنے والی عاصمہ شیرازی کے بارے میں بھی ایک فیچر شامل کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

اس شمارے میں ہم نے اسلام آباد کے امریکی سفارت خانہ کے اشتراک سے پاکستانی صحافیوں کو اپنی صلاحیتیں بہتر بنانے کا ایک شاندار ایجنسی پروگرام پیش کرنے والے ادارے ایسٹ ویسٹ سینٹر کے بارے میں بھی ایک مضمون شامل کیا ہے جس میں پاکستان میں امریکی مشن کے کام کے ایک اہم پہلو یعنی تربیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ذرائع ابلاغ کے اداروں، تعلیمی اداروں اور غیر سرکاری تنظیموں کے اشتراک سے ہم پاکستانی صحافیوں کو صحافت کے طور طریقوں کی بہترین تربیت دیتے ہیں اور انہیں سیاست، فنون، فوجی اور تعلیمی شعبوں میں اپنی دلچسپی کے موضوعات پر امریکہ کے رپورٹنگ دورے پر بھی بھجواتے ہیں۔

آخر میں ہمیں جمہوریت میں آزاد صحافت اور اظہار رائے کی اہمیت اور دنیا بھر میں امریکی حکمہ خارجہ کی طرف سے ان اقدار کی حمایت میں کئے جانے والے اقدامات کے بارے میں وزیر خارجہ جان کیری کے خیالات جاننے کا موقع ملے گا۔ اس شمارے کے مضامین کی تدوین کرنا بہت شاندار تجربہ رہا اور توقع ہے کہ آپ بھی انہیں پڑھ کر لطف اندوز ہوں گے۔ ہمیں اپنے خیالات سے آگاہ کیجئے گا اور بتائے گا کہ آپ آئندہ کیا پڑھنا پسند کریں گے۔ ہمیں آپ کی آراء کا انتظار رہے گا۔ ■

Cynthia R. Harvey

سنٹھیا ہاروی

ٹیچنگ ایڈیٹر و ترجمان امریکی سفارتخانہ اسلام آباد
ای میل ایڈریس: infoisb@state.gov ویب سائٹ: <http://islamabad.usembassy.gov>

SUPPORTING PRESS FREEDOM

BY SECRETARY OF STATE JOHN KERRY

آزادئى صحافت كى حمايت

وزير خارجہ كيرى جان

We all know that journalism can be dangerous. There's no way to eliminate the risk completely, except by keeping silent, and that's not in the cards. The world obviously needs to be informed about what is happening. Silence gives power to dictators, to the abusers, to tyrants. It allows tyranny to flourish, not freedom. And so we need people who are going to shed light on corruption and on crime. Exposing them can be dangerous, difficult, but equally critical to human rights.

By now, we're all familiar with the statistics. Nine media workers were among the dead in Paris. In 2014, at least 60 journalists were killed; 73 the year before that. Many others are wounded, harassed, detained, or threatened. These are record numbers, and they truly reflect the collective failure on the part of the world community to end some of these conflicts and to preserve peace. Each is a reminder that freedom of the press is not free but it is, in fact, very costly.

But how do we better protect journalists and other media workers who provide these windows on reality? There's nothing I'd like more as Secretary of State than to see war correspondents left with no stories to cover; but until that distant day arrives, it's going to remain the trademark of top international journalists to rush into places that other folks are desperate to escape. These journalists are also in danger, and the question today is: What more can we realistically do to help? Even though reporters aren't sent anywhere to fight, they're expected to do a job. And the more preparation that they have, frankly, the better the chances are for them to avoid danger.

Two years ago, the State Department launched what we call the SAFE Initiative, a pilot project to help local media workers in difficult regions. It now has five centers in various parts of the globe, and it's focused on digital and physical security, psychosocial care, information sharing, and the establishment of regional security advisory networks. And thus far, it has reached some 300 working journalists. Additionally, the U.S. Agency for International Development and State Department are implementing programs that support independent media in more than 30 countries, including an internet freedom program that provides outlets with long-term mentoring, tools, training, and techniques to help reporters keep themselves and keep their data safe.

More generally, under President Obama, we have made support for press freedom one of the recurring themes of United States foreign policy. Each day, American diplomats make known our firm support



ہم سب جانتے ہیں کہ صحافت خطرناک ہو سکتی ہے۔ اس خطرے کو مکمل طور پر ختم کرنے کا سوائے اس کے کوئی طریقہ نہیں کہ خاموش رہا جائے۔ لیکن ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ یقیناً دنیا کو ضرورت ہے کہ وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے آگاہی حاصل کرے۔ خاموشی تو آمروں، جاہلوں اور ظالموں کو مزید طاقتور بناتی ہے۔ یہ تو آزادی کو نہیں، بلکہ ظلم کو پسپا کرنے دیتی ہے۔ اسی لئے ہمیں ایسے لوگوں کی ضرورت پڑتی ہے جو بدعنوانیوں اور جرائم کو بے نقاب کریں۔ یہ کام خطرناک اور مشکل ہو سکتا ہے لیکن یہ انسانی حقوق کے لئے انتہائی ضروری ہے۔

اب تک ہم سارے اعداد و شمار سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ پیرس میں مرنے والوں میں نو افراد میڈیا کے کارکن تھے۔ 2014ء میں کم وبیش ساٹھ صحافیوں کو قتل کیا گیا۔ تہتر کو اس سے بچھلے برس اسی سلوک کا نشانہ بنایا گیا۔ بہت سوں کو زخمی کیا گیا ڈرایا دھمکایا گیا یا قید میں ڈالا گیا۔ یہ اعداد و شمار ایک ریکارڈ ہیں اور اس امر کی عکاسی کرتے ہیں کہ عالمی برادری بحیثیت مجموعی ان تنازعات کو ختم کرنے اور امن بحال کرنے میں ناکام رہی ہے۔ ہر واقعہ میں یہ یاد دلاتا ہے کہ آزادی صحافت آزاد نہیں بلکہ بہت ہی ہنگامی شے ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہم کس طرح سے حقائق سے روشناس کرانے والے صحافیوں اور میڈیا کے دیگر کارکنوں کو بہتر انداز میں تحفظ دے سکتے ہیں؟ امریکی وزیر خارجہ کی حیثیت سے میری تو یہ خواہش ہے کہ جنگوں کی کوریج پر مامور صحافیوں کے پاس

for the right of people to speak, publish, broadcast, blog, tweet, and otherwise express themselves openly and without fear and without retribution. And when journalists are unfairly detained, we always raise this issue in our meetings with foreign officials at every level, and that is true whether the journalist is an American such as Jason Rezaian, who is being held in Iran, or from some other country where the rights of journalists are violated all too often.

This is particularly important now because the world environment has obviously changed and changed significantly. It used to be that the primary threat to journalists was just being in the wrong place at the wrong time – you step on a landmine or you get in the way of a border or a fire or whatever happens. In the past, it was extremely rare for a member of the press to be intentionally targeted, stalked, followed. But in our era, roughly two-thirds of the reporters who die violently are killed because of, not despite, their profession. They are attacked for what they have written, silenced for what they have witnessed, or kidnapped for the leverage their capture may provide. And in most cases, the perpetrators are not caught.

The truth is that freedom of the press, whether symbolized by a pencil, a pen, a camera, or a microphone is under siege, purposefully. And that is because some people, some groups, and even some governments want to dictate the truth, want to define it, want to hide what we would know to be the truth. And obviously, we cannot



and we will not let that happen, especially after the outrage in Paris on January 7th, we need to make certain that we are taking all the steps in our power to reiterate our commitment to the values that bring all of you here today.

I have great confidence in the future of press freedom and the commitment of journalists to go out and find the truth and report on it no matter where they are and what the resistance and no matter how stark the danger, no matter how many efforts are made to shut you down. And we will stand with you every step of the way in all the ways that we have at our disposal.

We have a chance to make future generations of journalists a little safer, a little more secure. And I can guarantee you in doing so we all contribute to the possibilities of the truth winning out and of democracy getting stronger. ■

(Remarks delivered at the Journalist Security Conference, January 20, 2015, Washington, DC.)

رپورٹ کرنے کو کچھ نہ ہو لیکن جب تک یہ نہیں ہوتا اُس وقت تک دنیا بھر میں چوٹی کے صحافیوں کا یہ طرہ امتیاز رہے گا کہ وہ ایسی جگہوں کی طرف نکلےں جہاں سے دوسرے لوگ جان بچا کر بھاگنے کی فکر میں ہوں۔ یہ صحافی بھی خطرے سے دوچار ہیں اور آج ہمیں یہ سوال درپیش ہے کہ حقیقت پسندانہ اعتبار سے ہم اس صورت حال میں ان کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟ اگرچہ صحافیوں کو کسی بھی جگہ لڑنے کے لئے نہیں بھیجا جاتا لیکن اُن سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ایک اور نوعیت کا کام کریں۔ اگر وہ بہتر انداز میں تیار ہوں گے تو صاف بات یہ ہے کہ اس بات کا امکان زیادہ ہوگا کہ وہ خطرات سے بچ سکیں گے۔

دو برس پہلے دفتر خارجہ نے تجرباتی طور پر SAFE Initiative کے نام سے ایک منصوبہ شروع کیا جس کا مقصد مقامی صحافیوں کو دشوار علاقوں میں محفوظ فرام کرنا تھا۔ اس وقت اس کے پانچ مراکز دنیا کے مختلف علاقوں میں کام کر رہے ہیں۔ اس پروگرام کی توجہ ڈیجیٹل اور جسمانی سلامتی کو یقینی بنانے، نفسیاتی و سماجی دیکھ بھال کرنے، معلومات کے تبادلے اور علاقائی سلامتی مشاورتی نیٹ ورک کا قیام پر ہے۔ اب تک یہ پروگرام تین سو صحافیوں تک رسائی حاصل کر چکا ہے۔ علاوہ ازیں یو ایس ایڈ اور وزارت خارجہ نے تیس سے زائد ممالک میں آزاد ذرائع ابلاغ کی مدد کے لئے کئی پروگرام شروع کر رکھے ہیں۔ جس میں انٹرنیٹ فریڈم پروگرام بھی شامل ہے جس کا مقصد انٹرنیٹ کے مراکز کو طویل سرپرستی، آلات اور تربیت مہیا کر کے اس قابل بنانا ہے کہ وہ رپورٹروں کو اپنا آپ اور اپنا ڈیٹا محفوظ بنانے میں مدد دے سکیں۔

عمومی طور پر صدر اوباما کے دور میں آزادی صحافت کی حمایت امریکی خارجہ پالیسی کا ایک اہم جزو رہی ہے۔ ہر روز امریکی سفارت کار لوگوں کے بولنے، شائع کرنے، نشر کرنے، بلاگ بنانے، ٹویٹ کرنے اور اس کے علاوہ بھی کسی خوف و خطرے سے بے نیاز ہو کر اظہار رائے کی آزادی کے حق میں اپنی بھرپور حمایت کا اعادہ کرتے ہیں اور جب صحافیوں کو غیر منصفانہ طور پر گرفتار یا پکڑا جاتا ہے تو ہم ہر سطح پر غیر ملکی حکام کے ساتھ اس مسئلے کو اٹھاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ایسا صحافی ایران میں گرفتار ہونے والا امریکی جیسٹین رضیان ہو یا کسی ایسے ملک سے تعلق رکھتا ہو جہاں صحافیوں کے حقوق اکثر پامال کئے جاتے ہوں ہم ہر کسی کے لئے آواز اٹھاتے ہیں۔

یہ اس لئے بھی اہم ہے کہ دنیا کا ماحول بہت زیادہ تبدیل ہو چکا ہے۔ اب تک تو صحافیوں کو یہ خطرہ درپیش ہوتا تھا کہ وہ کسی غلط وقت پر کسی غلط مقام پر پائے جاتے تھے۔ ممکن ہے آپ کا پاؤں کسی بارودی سرنگ پر آ جائے یا آپ سرحد پار کر لیں یا فائرنگ کی زد میں آ جائیں یا اس طرح کا کوئی اور کام ہو جائے۔ ماضی میں یہ بات بہت ہی کم ہوتی تھی کہ کسی صحافی کو جان بوجھ کر نشانہ بنایا جائے یا اُس کا پیچھا کیا جائے۔ لیکن ہمارے اس دور میں مارے جانے والے دو تہائی صحافی صرف اپنے پیشگی وجہ سے نشانہ بنائے گئے۔ اُن پر اُن کی تحریروں کی وجہ سے حملے کئے گئے۔ انہیں اس لئے خاموش کیا گیا کہ انہوں نے کچھ دیکھ لیا تھا۔ یا انہیں اس وجہ سے انہو کیا گیا کہ اس سے اُن کے انکوائروں کو کچھ رعایتیں مل سکتی تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر واقعات میں مجرم نہیں پکڑے جاسکے۔

سچ تو یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ کی آزادی، اس بات سے قطع نظر کہ اس کی علامت ایک سینیٹل، ایک بین، ایک کیرہ یا ایک مائیکروفون ہے، محاصرے میں ہے۔ اور یہ اس وجہ سے ہے کہ کچھ لوگ، کچھ گروہ یہاں تک کہ کچھ حکومتیں اپنا سچ مسلط کرنا چاہتی ہیں، اپنی پسند کی وضاحت چاہتی ہیں اور سچ کو، جو ہم جان سکتے ہوں پوشیدہ رکھنا چاہتی ہیں۔ یقیناً ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے اور نہ ہی دیں گے، خاص طور پر سراسر جنوری کو پیرس میں ہونے والے واقعہ کے بعد۔ ہمیں یہ بات واضح کرنی ہے کہ ہم اُن اقدار کے تحفظ کے لئے تمام دستیاب وسائل استعمال کریں گے۔ جن کی بدولت آج ہم سب یہاں جمع ہیں۔

مجھے ذرائع ابلاغ کی آزادی کے مستقبل اور صحافیوں کے اس عزم پر پورا بھروسہ ہے کہ وہ سچ جاننے اور اس کے بارے میں خبر دینے میں ہرگز نہیں ہچکچائیں گے۔ قطع نظر اس بات کے کہ وہ کہاں ہیں، انہیں کس قدر شدید مزاحمت کا سامنا ہے۔ خطرات کس قدر واضح ہیں اور انہیں خاموش کرنے کی کتنی ہی کوششیں کیوں نہ کی جائیں ہم ہر قدم پر تمام دستیاب وسائل کے ساتھ آپ کے ہمراہ ہوں گے۔

ہمارے پاس اب یہ موقع ہے کہ صحافیوں کی اگلی نسلوں کے لئے مستقبل کو قدرے زیادہ محفوظ بنالیں اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسا کرتے ہوئے ہم سچ کی جیت اور جمہوریت کے مزید مضبوط ہونے کے امکانات میں اضافہ کریں گے۔ ■

یکھاتے 20 جنوری 2015ء کو واشنگٹن ڈی سی میں منعقدہ جرنلسٹ سیکورٹی کانفرنس میں ادا کئے گئے۔



AT THE PODIUM

U.S. DEPARTMENT OF STATE SPOKESPERSON JEN PSAKI

مرکزنگاہ: امریکی محکمہ خارجہ کی ترجمان جین ساکی

BY MANAGING EDITOR, CYNTHIA HARVEY

U.S. Embassy Islamabad Spokesperson

تحریر: سنڈی ہاروے، ہیجنگ ایڈیٹر،
ترجمان امریکی سفارت خانہ اسلام آباد

On January 13, 2015 at the Ministry of Foreign Affairs in Islamabad, all eyes were on Pakistan's Adviser to the Prime Minister for National Security and Foreign Affairs Sartaj Aziz and U.S. Secretary of State John Kerry as they concluded the plenary session of the Pakistan-U.S. Strategic Dialogue. Entering a large hall, they convened a press conference where they spoke to hundreds of Pakistani, American, and international journalists who asked tough questions and expected good answers.

These journalists were playing an essential role in U.S.-Pakistani relations. By filing stories with their newspapers, television stations, and websites, they were documenting for history the outcomes of

13 جنوری 2015ء کو وزارت خارجہ اسلام آباد میں تمام تر نگاہیں پاکستان کی قومی سلامتی و خارجہ امور پر وزیر اعظم کے مشیر سرتاج عزیز اور امریکی وزیر خارجہ جان کیری پر مرکوز تھیں جو کہ پاکستان - امریکہ ترقیاتی مذاکرات کے بھرپور اجلاس کا اختتام کر رہے تھے۔ ایک بڑے ہال میں داخل ہو کر انہوں نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا جس میں سینکڑوں کی تعداد میں شریک پاکستانی، امریکی اور دیگر ملکوں سے تعلق رکھنے والے صحافی سخت سوالات کر کے ان کے اچھے جوابات کے منتظر تھے۔

یہ صحافی پاکستان - امریکہ تعلقات میں ایک اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ اپنے اخبارات، ٹیلی ویژن اسٹیشنز اور ویب

this session of the Strategic Dialogue and ensuring that Pakistanis, Americans, and people around the world had up-to-date information which would their deepen understanding and inform their opinions.

The journalists didn't play this role alone. They had help from the person leading the question and answer session from behind the podium: Jen Psaki, Spokesperson for the U.S. Department of State. Since becoming Secretary of State in 2013, Secretary Kerry has traveled to 58 countries, flying a total distance of 680,000 miles (and counting!). Jen Psaki has been by his side for almost every one of these trips, supporting him as he travels to all corners of the world to serve at President Obama's representative at international forums, negotiating treaties and other international agreements, and conducting everyday face-to-face diplomacy. As Spokesperson,

سائٹس کو خبریں ارسال کر کے تیز رفتاری مذاکرات کے اس اجلاس کے نتائج کی تاریخ مرتب کر رہے ہیں اور پاکستانیوں، امریکیوں اور پوری دنیا کے لوگوں کو ایسی تازہ ترین اطلاعات فراہم کر رہے ہیں جو ان کے علم اور معاملات کو سمجھنے کے شعور میں اضافہ کرنے کا باعث ہوں گی۔

صحافی اپنا یہ کردار ادا کرنے میں تنہا نہیں تھے۔ پوڈیم کے پیچھے سے سوال و جواب کا دور آگے بڑھانے میں انہیں امریکی وزارت خارجہ کی ترجمان جین ساسکی کی مدد حاصل تھی۔ 2013ء میں وزیر خارجہ کا منصب سنبھالنے کے بعد سے وزیر خارجہ جان کیری نے اٹھاون ملین کے دورے کرتے ہوئے چھ لاکھ اسی ہزار میل کا سفر کیا ہے اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ ان تمام دوروں کے دوران میں صدر اوباما کے نمائندے کی حیثیت سے دنیا کے کونے کونے میں عالمی فورمز پر اور معاہدوں کے لئے مذاکرات کرنے اور روزمرہ کے سفارتی فرائض سرانجام دینے میں جین ساسکی ان کے ہمراہ رہتے ہوئے ان کی مدد کرتی ہیں۔ ترجمان کی حیثیت سے جین ساسکی وزیر خارجہ جان کیری اور ان کے ہم منصبوں کو پریس کانفرنسوں، سوشل میڈیا یا رابطوں اور صحافیوں کے ساتھ انٹرویوز کا اہتمام کر کے انہیں اپنا پیغام پہنچانے کے مواقع فراہم کرتی ہیں۔

پریس کانفرنس کے بعد جین نے اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ لمحات نکالے اور ہمیں پاکستان، صحافت اور اپنی ذات کے حوالے سے بتایا۔ وہ کئی برس سے سرکاری ملازمت کر رہی ہیں۔ انہوں نے کہا: ”میں وزیر خارجہ جان کیری کو کافی عرصے سے جانتی ہوں۔ دس برس پہلے جب وہ صدارت کے امیدوار تھے۔ تو اُس وقت بھی میں ان کے ساتھ تھی۔ اب ہر چیز مکمل طور پر بدل چکی ہے۔ میں نے صدر اوباما کے لئے گذشتہ آٹھ برس کام کیا۔ اور میں بہت خوش قسمت ہوں کہ دو برس پہلے مجھے وزارت خارجہ میں اس عہدے پر آنے کا موقع ملا۔ ایک بار پھر وزیر خارجہ جان کیری کی ٹیم کا حصہ بننا اور ان کے ہمراہ دنیا کے کونے کونے کا سفر کرتے ہوئے تاریخ بنانے میں اگلی نشست پر براہمان ہونا بہت شاندار تجربہ ہے۔ میں ہر روز اس تجربے سے لطف اندوز ہوتی ہوں۔“

Jen creates opportunities for Secretary Kerry and his counterparts to communicate key messages through press conferences, social media outreach, and interviews with journalists.

Following the press conference, Jen took a moment to tell us a bit about her herself, her impressions of Pakistan, and thoughts about journalism. She has been in government service for many years saying, “I have known Secretary Kerry for some time... I worked for him when he ran for President ten years ago. Now, everything has gone full circle. I worked for President Obama for about eight years and I was fortunate enough two years ago to find a place in the State Department. It has been wonderful to join Secretary Kerry's team again and to have a 'front seat to history' by traveling around the world with him. I enjoy it every day!”

اسلام آباد میں قیام کے دوران میں جین ساسکی کو جو بات بہت اچھی لگی وہ یہ تھی کہ سینئر مشیر سر تاج عزیز اور وزیر خارجہ جان کیری کی پریس کانفرنس میں خواتین صحافیوں کی بہت بڑی تعداد شریک تھی۔ ان خواتین کے حوالے سے انہوں نے کہا کہ یہ اپنے ملک کے عوام کو خبریں دے کر بہت اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ یہ خبریں ان لوگوں کے بارے میں ہو سکتی ہیں جو شورش زدہ علاقوں میں رہ رہے ہیں یا یہ ایسے عام لوگوں کے حوالے سے بھی ہو سکتی ہیں جن کے پاس کہنے کو اپنی دلچسپ باتیں ہوں۔ انہوں نے کہا کہ یہ باتیں اور کہانیاں بتاتی رہیں۔ صحافی روزانہ لوگوں کی آواز بنتے ہیں۔ ایسا کرنے کی صلاحیت اور موقع فراہم ہونا ایک تحفہ ہے۔ میں جانتی ہوں کہ ایسا کرنا ہمیشہ آسان نہیں ہوتا لیکن میں ہمیشہ اپنے کام سے ایسی کوششوں کی حمایت کرتی ہوں اور ہم امریکہ میں اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔

One of the things Jen especially enjoyed when she was in Islamabad was seeing so many women journalists participating in the press conference with Secretary Kerry and Senior Advisor Aziz. Speaking about these women, she said, “you have such an important role to play in telling the story of people in your country; these can be about people in places where there are conflicts, or about regular people with wonderful personal stories. Keep telling those stories! What journalists do every day is to give a voice to the people. It is a gift to be able to do this. I know that it is not always easy, but it is something that I try to support though my work, and we care about a lot in the United States.”

جین کا کہنا تھا کہ خواتین صحافت کے شعبے میں خصوصی صلاحیتیں لے کر آتی ہیں۔ انہوں نے پاکستانی صحافی خواتین کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی ان صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کریں۔ میں نے دیکھا ہے کہ خواتین کو کہانیاں بیان کرنے کا ایک خاص سلیقہ حاصل ہوتا ہے۔ وہ اکثر کہانی میں جا کر ذاتی سوالات بھی پوچھ لیتی ہیں اور خاموش رہنا بھی جانتی ہیں۔ اس صلاحیت کی وجہ سے خواتین صحافت اور سرکاری پالیسیوں میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ دنیا بھر اور پاکستان میں خواتین صحافیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ ■

Jen mentioned that women bring special skills to the field of journalism and encouraged Pakistani journalists to make the most of these unique qualities. “I have found that women have a different way of telling stories. They often delve more into the personal side and are able to ask better questions and stay calm. Because of this, women have an important role to play in public policy and in journalism. Hopefully, their numbers will keep growing in Pakistan and around the world.” ■

JOURNALISM IS A WAY OF LIFE

صحافت ایک طرز زندگی ہے

By Asma Shirazi

Executive Vice President and Senior Anchorperson with BOL Media

تحریر: عاصمہ شیرازی، ایگزیکٹو نائب صدر و سینئر اینکر پرسن، بول میڈیا گروپ



At present, I am the Executive Vice President with BOL media group and a Senior Anchorperson. However, my journey began long before this.

I started my career as a college student. At that time I was an anchor for Radio FM and Radio Pakistan's current affairs department. In 2001, I joined PTV News as reporter/producer and then in 2002 I joined Geo News as its pioneer team member. I covered the Parliament, Federal Cabinet, Election Commission, and political parties, and had the honor of being the first female Parliamentary correspondent of Pakistan's electronic media. In addition to covering major national and international stories, I interviewed several world renowned leaders including the Presidents and Prime Ministers of Pakistan.

From the Geo News platform, I covered the Lebanon-Israel War from the frontlines and was publicly honored as the first female war

اس وقت میں بول میڈیا گروپ میں ایگزیکٹو نائب صدر کے عہدے پر فائز ہوں اور سینئر میزبان ہوں۔ تاہم میرا یہ سفر بہت پہلے شروع ہوا تھا۔

میں نے اپنے اس سفر کا آغاز اُس وقت کیا جب میں کالج میں پڑھ رہی تھی۔ اُس وقت میں ایف ایم ریڈیو اور ریڈیو پاکستان کے شعبہ حالات حاضرہ کے پروگراموں میں میزبان کے طور پر کام کرتی تھی۔ پی ٹی وی نیوز میں رپورٹر اور پروڈیوسر کی حیثیت سے 2001ء میں مجھے کام کرنے کا موقع ملا اور 2002ء میں جیو نیوز کی بنیاد رکھنے والی ٹیم کی رکن بنی۔ میں نے پارلیمنٹ، وفاقی کابینہ، الیکشن کمیشن اور سیاسی جماعتوں کی کوریج کی اور مجھے پاکستان کے ایکٹرا تک میڈیا کے لئے پارلیمنٹ کی کوریج کرنے والی پہلی خاتون نمائندہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ بڑی قومی اور عالمی خبروں کی کوریج کے ساتھ ساتھ میں نے پاکستان کے صدور اور وزراء، اعظم سمیت کئی معروف عالمی رہنماؤں کے انٹرویوز بھی کئے۔

جیو نیوز کے لئے میں نے نماز پر جا کر لبنان۔ اسرائیل جنگ کی کوریج کی اور میں ایسا کرنے والی پاکستان کی پہلی خاتون

correspondent of Pakistan. I presented live coverage of the war-ravaged areas of Lebanon and interviewed Hezbollah Commanders, as well as Lebanese President Emil Lahod. My crisis reporting for Geo News included covering the 2005 Pakistani earthquake from the devastated city of Balakot, where I presented nonstop crisis coverage for twelve days.

In 2007, I joined ARY News as a Senior Anchorperson and the only female. During my tenure there, five other anchorpersons and I were banned from appearing on screen by General Pervez Musharraf when he declared a state of emergency. Then in 2010, I joined SAMAA news channel and launched a public show entitled "Faisla Aap Ka (Decision is Yours)." It was a live broadcast from the streets of Pakistan, holding officials accountable right in front their constituents. Lastly in 2012, I joined Dawn News as Senior Anchorperson/ Analyst and conducted the prime time program, "Faisla Awam Ka (Decision of the People)."

As my career reflects, journalism is my passion. I not only ask questions, I amplify the voices of those who have a direct impact on policies. I not only host programs, I hold the movers and shakers of our country accountable to the public. Beyond this, my dream is to excel in the quest for truth both locally and internationally. I wish to contribute something better for our future generations. And I wish to advocate the fact that women are role models in media, and just like any other profession, women can overcome challenges and prove that they are unbeatable.

My work has earned me some international recognition, for example in 2014, I became the first Pakistani journalist to receive the Peter Mackler Award for Courage and Ethical Journalism and I was given the honor to receive it at the National Press Club in Washington, D.C. This annual award is given in joint collaboration with the Global Media Forum, Reporters without Borders and Agence France-Presse (AFP). In that same year, I also received a Journalism Award from the New York City Council.

In Pakistan, I was awarded with the Heroes Foundation Award in 2013, the National Media Award for Best Current Affairs Anchorperson of Pakistan in 2012, and Made in PTV in 2012. Despite the awards I've received, truly having an accomplished career as a woman in media is a long journey, and I still have a long way to go. One can aspire to have international fame, like CNN's Christiane Amanpour for example, but this demands hard work, commitment, and an encouraging environment for journalists.

I admire the constitutionalism and concern for democracy that USA espouses. It's a country with a spirit of tolerance, protecting the rights of every individual including freedom of the press. Unfortunately, the situation here is different. The emergence of terror groups like the Taliban, sectarian groups, and militants have made it almost impossible for journalists to work freely. Furthermore, pressure by an irresponsible government, a lack of support/training from organizations, and editorial compromises for the sake of commercialism, further limit our ability to investigate and maintain journalistic ethics.

Journalism in Pakistan is constantly under attack from various entities, and so for women, it is even harder to fight for survival. From societal pressures to death threats and actual harassment, it's a miracle that women in media manage to safeguard themselves and perform at the level that they do. Journalism is not only a challenging job, it's also a way of life. It is more passion than profession. Women who are resolute to take up journalism's many challenges can excel in the field because the potential exists. They only need encouragement and trust, and they can prove that they are the best with their commitment and dedication. ■

نمائندہ تھی اس بات کا عوامی سطح پر اعتراف بھی کیا گیا۔ میں نے جنگ سے تباہ ہونے والے لبنانی علاقوں سے لائیو پروگرام کئے اور حزب اللہ کے کارکنوں اور لبنان کے صدر امیل لہود سے انٹرویوز کئے۔ میری رپورٹوں کے لئے بحرانون کی کوریج میں پاکستان میں آنے والا 2005ء کا زلزلہ بھی شامل ہے۔ میں نے بالاکوٹ شہر سے زلزلے سے ہونے والی تباہ کاریوں سے پیدا ہونے والی صورت حال کے بارے میں بارہ روز تک متواتر رپورٹنگ کی۔

2007ء میں مجھے اے آر وائی میں واحد خاتون سینئر میزبان بننے کا موقع ملا۔ جب سابق صدر جنرل مشرف نے ہنگامی حالت نافذ کی تو میں اُن پانچ ٹیلی ویژن میزبانوں میں شامل تھی جنہیں جنرل مشرف کے حکم پر سکرین پر آنے سے روک دیا گیا تھا۔ میں 2010ء میں ساء نیوز چینل میں شامل ہوئی اور ایک عوامی شو "فیصلہ آپ کا" کے نام سے شروع کیا۔ یہ پروگرام پاکستان کی سڑکوں، گلیوں اور بازاروں سے لائیو بیچھل کیا جاتا تھا۔ اور اس میں حکام کو اُن کی ذمہ داریوں کے حوالے سے موقع پر جواب دہی کرنا پڑتی تھی۔ 2012ء میں جب میں ڈان نیوز میں سینئر میزبان / تجزیہ کار کی حیثیت سے شامل ہوئی تو میں نے پرائم ٹائم پروگرام "فیصلہ عوام کا" کے نام سے شروع کیا۔

جیسا کہ میرے کیریئر سے ظاہر ہوتا ہے صحافت میرا شوق ہے۔ میں نہ صرف سوالات کرتی ہوں بلکہ میں اُن لوگوں کی آواز بھی اُگے پہنچاتی ہوں جو پالیسیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں سچ کی تلاش میں ملکی اور عالمی سطح پر اپنا آپ منوانا چاہتی ہوں۔ میں اپنی آنے والی نسلوں کے لئے کچھ بہتر کرنا چاہتی ہوں۔ میری یہ بھی خواہش ہے کہ میں اس حقیقت کا پرچار کروں کہ خواتین ذرائع ابلاغ میں مشعل راہ ہیں اور کسی بھی دوسرے شعبے کی طرح خواتین تمام مشکلات پر قابو پا کر یہ ثابت کر سکتی ہیں کہ وہ ناقابل شکست ہیں۔

مجھے اپنے کام کی وجہ سے عالمی سطح پر پذیرائی ملی ہے۔ مثال کے طور پر میں پہلی پاکستانی خاتون صحافی ہوں جسے 2014ء کا "Peter Mackler Award for Courage and Ethical Journalism" دیا گیا ہے۔ اور مجھے یہ انعام واشنگٹن ڈی سی کی نیشنل پریس کلب میں حاصل کرنے کا اعزاز ملا۔ یہ سالانہ ایوارڈ گلوبل میڈیا فورم، Reporters without Borders اور Agence France Presse (AFP) کی طرف سے مشترکہ طور پر دیا جاتا ہے۔ اسی برس مجھے نیویارک سٹی کونسل کی طرف سے بھی ایک جرنلزم ایوارڈ دیا گیا۔ پاکستان میں مجھے 2013ء میں ہیروز فاؤنڈیشن ایوارڈ دیا گیا۔ 2012ء میں مجھے پاکستان میں حالات حاضرہ کی بہترین میزبان ہونے کا ایوارڈ ملا اور اسی برس Made in PTV اعزاز بھی دیا گیا۔ اس سارے اعزازات کے باوصف، مجھے ایک خاتون ہونے کے ناطے ذرائع ابلاغ میں اس قدر کامیابیاں سیکھنے میں ایک طویل سفر طے کرنا پڑا ہے اور یہ سفر ابھی ختم نہیں ہوا۔ ابھی مجھے مزید اُگے جانے ہے۔ کسی کے دل میں سی این این کی کرشمین امان پوری کی طرح عالمی سطح پر پہچان بنانے کی خواہش بھی کر سکتی ہے لیکن اس کے لئے سخت محنت، اپنے فرائض سے لگن اور صحافیوں کے لئے ایک حوصلہ افزا ماحول درکار ہوگا۔

میں آئین کی پاسداری اور جمہوریت کے استحکام کے لئے امریکہ کی ٹیک وڈو کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہوں۔ اس ملک میں برداشت کا جذبہ پایا جاتا ہے اور ذرائع ابلاغ کی آزادی سمیت ہر فرد کے حقوق کا تحفظ کیا جاتا ہے۔ بد قسمتی سے یہاں صورت حال مختلف ہے۔ طالبان، فرقہ وارانہ تنظیموں اور جنگجوؤں ایسے دہشت گرد گروپوں کے نمودار ہونے کی وجہ سے صحافیوں کے لئے آزادی سے کام کرنا تقریباً ناممکن ہو چکا ہے۔ مزید برآں غیر ذمہ دار نہ حکومت کے دباؤ، اداروں کے سطح پر موزوں تربیت اور حمایت کے فقدان اور تجارتی مفادات کے لئے ادارتی اصولوں پر سمجھوتوں کی وجہ سے ضروری چھان بین کرنے اور صحافتی اخلاقیات کو ملحوظ خاطر رکھنے کے حوالوں سے ہماری اہلیت اور زیادہ محدود ہو چکی ہے۔

پاکستان میں صحافت کو مسلسل بہت سے اطراف سے حملوں کا سامنا ہے اور خواتین کے لئے تو اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی جدوجہد ہی خاصی مشکل ہے۔ سماجی دباؤ سے لے کر قتل کی دھمکیوں اور ہراساں کے جانے تک کے عوامل کے پیش نظر تو یہ بات ایک معجزے سے کم نہیں ہے کہ ذرائع ابلاغ میں خواتین نہ صرف اپنی حفاظت کر رہی ہیں بلکہ وہ مقدور بھر بہتر کام بھی کر رہی ہیں۔ صحافت نہ صرف خطرات سے بھر ایک کام ہے بلکہ یہ ایک طرز زندگی کا نام ہے۔ اسے ایک پیشہ نہیں بلکہ شوق کہا جائے تو بجا ہوگا جو خواتین صحافت کے متنوع خطرات سے تہرہ آ زما ہونے کے لئے تیار ہوں وہ اس شعبے میں کامیاب ہو سکتی ہیں کیونکہ اس کی گنجائش بہت ہے۔ انہیں صرف اعتماد اور حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ پھر وہ ثابت کر سکتی ہیں کہ اپنے عزم و ہمت اور لگن میں کسی سے کم نہیں۔ ■



NEVER STOP

LEARNING

INTERVIEW WITH JANEL KNIGHT

NEWS ANCHOR AND REPORTER FOR ABC 27 NEWS HARRISBURG, PA, U.S.

کبھی بھی سیکھنے سے گریز نہ کریں: جینل نائٹ سے انٹرویو

اے بی سی 27 نیوز ہیئرس برگ، پنسلوانیا کی نیوز اینکر اور رپورٹر

PLEASE DESCRIBE YOUR ROLE IN MEDIA. INCLUDE A DESCRIPTION OF HOW YOUR WORK GETS DONE ON A DAILY BASIS.

I do a variety of roles in the newsroom. I anchor the weekend morning news show at abc27 News in Harrisburg, PA. It is an hour-long newscast that airs on Saturday and Sunday mornings. I am also responsible for producing the show. I select and write all of the stories that will air during the newscasts. During the week, I serve as one of the morning reporters. I report on something different every

ازراہ کرم ذرائع ابلاغ میں اپنے کردار پر روشنی ڈالنے اور بتانے کہ آپ روزمرہ کا کام کیسے نمٹاتی ہیں؟

میں نیوز روم میں بہت سی خدمات سرانجام دیتی ہوں۔ میں ہیئرس برگ میں اے بی سی 27 نیوز کے چھٹی والے دنوں صبح کی خبروں کا شو کرتی ہوں۔ ہفتے اور اتوار کی صبح آن ایئر جانے والے والا یہ شو ایک گھنٹہ دورانیے کا ہے۔ میں اس شو کی پروڈیوسر بھی ہوں۔ اس شو کے دوران میں نشر ہونے والی تمام خبروں کا انتخاب میں خود کرتی ہوں انہیں لکھتی ہوں۔ ہفتے کے باقی دن میں صبح کی رپورٹ کے طور پر کام کرتی ہوں۔ میں ہر روز کسی نئے اور مختلف موضوع پر کام کرتی ہوں۔ بعض

day. Sometimes I am at the scene of breaking news. My story could be a house fire or an accident that will affect people trying to get to work that morning. Sometimes my assignment is light in nature. I've even skated with Disney on Ice characters and performed with clowns on live television.

HOW DID YOU COME INTO THIS ROLE? (LIFE LONG DREAM? EDUCATIONAL BACKGROUND? CAREER SWITCH?)

I have wanted to be a reporter since I was 7-years-old. On a family trip to Washington D.C. I played reporter with our family video camera documenting every moment of our trip. I also read the morning announcements for my high school television station. I graduated from American University with a bachelor's degree in broadcast journalism and a double minor in multi-ethnic studies and justice. I started my career in Johnstown, PA at WJAC. I spent three years there before getting my current job at abc27 WHTM in Harrisburg, PA.

WHAT DO YOU FEEL IS YOUR GREATEST ACCOMPLISHMENT WORKING IN MEDIA SO FAR?

I think my greatest accomplishment so far has been sticking with my career. My job can be very stressful. While I live with my husband in Harrisburg I live nearly 400 miles away from the rest of my family. It can be difficult being far away from them. However, when I call to vent about my demanding day they remind that being a reporter has always been my dream.

WHAT ARE THE GENERAL CHALLENGES OF WORKING IN THE MEDIA ENVIRONMENT TODAY?

Television news is very fast-paced. It's important to get all of the facts correct and on air on time. While everyone makes mistakes at work I am under a lot of pressure because if I make a mistake it is in front of thousands of people watching television at home.

DO YOU BELIEVE THAT BEING A WOMAN AFFECTS YOUR WORK? WHY OR WHY NOT?

I think there is a huge amount of pressure for women to keep up their appearances in television news. Often people don't listen to what we are saying, but instead focus on the clothes we are wearing and our hair. Men don't get the same treatment or criticism. For example, you'll see men with gray hair on television, but not women.

WHAT IS YOUR ADVICE TO OTHER YOUNG WOMEN EAGER TO PLAY A ROLE IN MEDIA?

My advice is to develop thick skin. Some people are going to love you and others aren't and they can be mean. The comments on stories we post on the web and Facebook can be harsh. I try to never to take them personally. Also never stop learning. I try to read as much as I can about becoming a better reporter. I learn a lot from watching others in the industry. You are never too good to learn something new. ■

اوقات میں بریکنگ نیوز کے جانے وقوع پر موجود ہوتی ہوں۔ یہ کسی گھر میں لگنے والی آگ یا کسی ایسے حادثے کی خبر بھی ہو سکتی ہے جس سے صبح کے وقت دفتروں کو جانے والے لوگ متاثر ہو سکتے ہوں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ میری ذمہ داری قدرے ہلکی چھلکی نوعیت کی ہوتی ہے۔ میں نے لائیو ٹیلی ویژن شو میں مسخروں کے ساتھ اداکاری کی ہے اور ڈزنی میں برف کے کرداروں کے ساتھ اسکیٹنگ کی ہے۔

آپ نے یہ کام کیسے اپنایا؟ (کیا یہ آپ کی دلی خواہش تھی، آپ کا تعلیمی پس منظر اسی کا تھا، یا

آپ نے اپنا پیشہ خود تبدیل کیا؟)

میں سات برس کی عمر سے رپورٹر بننے کی خواہش رکھتی تھی۔ اپنے خاندان کے ہمراہ واشنگٹن ڈی سی جانے پر میں رپورٹر کی ذمہ داری سنبھال لیتی تھی اور دو یوٹیوب ویڈیو کے ذریعے اس سفر کے ہر لمحے کو محفوظ کرتی تھی۔ میں اپنے اسکول کے ٹیلی ویژن اسٹیشن پر صبح کے اعلانات بھی کرتی تھی۔ میں نے براؤڈ کاسٹ جرنلزم میں امریکن یونیورسٹی سے بیچلرز کی ڈگری حاصل کی ہے۔ میں نے انصاف اور کثیر النسل علوم کی تعلیم بھی حاصل کی ہے۔ میں نے WJAC پر جوائنٹ ٹاؤن میں اپنی ملازمت شروع کی۔ اور ہیرس برگ میں اے بی 27 WHTM کی موجودہ ملازمت پر آنے سے پہلے میں نے تین برس وہاں کام کیا۔

میڈیا میں کام کرتے ہوئے آپ اب تک کس کام کو اپنی سب سے بڑی کامیابی سمجھتی ہیں؟

میرے خیال میں میری سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ میں اب تک اپنے اس شعبے سے منسلک ہوں۔ میرا کام بہت زیادہ دباؤ والا بھی ہو سکتا ہے۔ اگرچہ میں اپنے شو ہر کے ہمراہ ہیرس برگ میں رہ رہی ہوں لیکن میں اپنے باقی اہل خانہ سے چار سو میل دوری کے فاصلے پر ہوں۔ اپنے گھر والوں سے اس قدر دور رہنا خاصا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ جب میں اپنے مصروف دن کی سرگرمیوں کا بتانے کے لئے فون کرتی ہوں تو وہ مجھے یاد دلاتے ہیں کہ میں تو ہمیشہ سے رپورٹر بننے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔

آج کل کے ماحول میں ذرائع ابلاغ میں کام کرنے میں کون سے عام چیلنج درپیش ہوتے ہیں؟

ٹیلی ویژن پر خبروں کا کام نہایت تیز رفتار ہوتا ہے۔ تمام حقائق کو اکٹھا کر کے بروقت ٹیلی کاسٹ کرنا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ہر کسی سے کام کے دوران میں غلطیاں ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ مجھ پر بھی کام کے دوران بہت زیادہ دباؤ ہوتا ہے کہ اگر میں کوئی غلطی کروں تو اسے گھروں میں بیٹھے ٹیلی ویژن دیکھنے والے ہزاروں لوگ بھی دیکھ لیں گے۔

کیا آپ کے خیال میں خاتون ہونے کے ناطے آپ کا کام متاثر ہوتا ہے؟ اگر نہیں ہوتا تو

کیوں اور اگر ہوتا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟

میرا خیال ہے کہ ٹیلی ویژن پر خبریں پیش کرنے والی خواتین پر اُن کی ظاہری شکل و صورت اور لباس کے حوالے سے بہت زیادہ دباؤ ہوتا ہے۔ اکثر لوگ ٹیلی ویژن پر وہ کچھ نہیں سنتے جو ہم کہہ رہے ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ ہمارے کپڑوں اور ہمارے بالوں کے سٹائل پر غور کر رہے ہوتے ہیں۔ مردوں کے ساتھ یہ سلوک یا اُن پر اس طرح کی تنقید نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر آپ ٹیلی ویژن پر سفید بالوں والے مردوں کو تو دیکھتے ہوں گے لیکن کبھی کسی سفید بالوں والی خاتون کو نہیں دیکھا ہوگا۔

ذرائع ابلاغ میں کام کرنے کی خواہش مند دیگر نوجوان خواتین کو آپ کیا مشورہ دینا چاہیں گی؟

میرا مشورہ ہوگا کہ آپ سنی ان سنی کرنا سیکھ لیں۔ کچھ لوگ آپ سے بیار کریں گے اور بعض کمینٹی فطرت والے آپ سے نفرت۔ ویب اور فیس بک پر پوسٹ کی گئی خبروں پر آپ کو بہت شدید رد عمل دیکھنے کو مل سکتا ہے۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ اسے ذاتی طور پر نہ لوں اور یہ کبھی بھی سیکھنے سے گریز نہ کریں۔ میں ایک اچھی رپورٹر بننے کے لئے جس قدر زیادہ ممکن ہو پڑھتی ہوں۔ میں ٹیلی ویژن پر دوسروں کو دیکھتے ہوئے اُن سے بہت کچھ سیکھتی ہوں۔ آپ کو ہمیشہ کچھ نیا سیکھنے کی ضرورت بہر حال رہتی ہے۔ ■

GIVING OUR CHILDREN MENTORS AND HEROES

Interview with Sharmeen Obaid,
Documentary Filmmaker, Pakistan

ہم بچوں کو ہیرو اور تالیق دے رہے ہیں

پاکستانی دستاویزی فلم ساز شرمین عبید سے انٹرویو



پچھلے برس ایس او سی فلمز نے اے آروائی فلمز کے ساتھ ”واڈی انیمیشنز“ کے نام سے ایک نیا پروڈکشن ہاؤس بنانے کے لئے شراکت کی۔ یہ ادارہ صرف اپنی میڈیا فلمیں تیار کرے گا۔ اس وقت ہم پاکستان کی پہلی اپنی میڈیا فلم ”3 بہادر“ کی تیاری کے آخری مراحل میں ہیں اور میں اس فلم کو حتمی شکل دینے میں بے حد مصروف ہوں۔ ہم مختلف کھیل، تصویری خانوں پر مشتمل کہانیاں اور کتب تیار کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم اسکولوں تک پہنچنے کا ایک سفر بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ جس میں ہم ملک بھر میں بچوں کو فلموں کے نکلنے دیکھا کر اپنا ماحول بہتر بنانے کی ترغیب دیں گے۔

آپ نے یہ کام کیسے اپنایا؟ (کیا یہ آپ کی دلی خواہش تھا، آپ کا تعلیمی پس منظر اسی کا تھا، یا آپ نے اپنا پیشہ خود تبدیل کیا؟)

دستاویزی فلمیں بنانے اور بیانیہ پر مشتمل کہانیاں سنانے میں میری دلچسپی کا آغاز 2001ء میں شروع ہوا جب گیارہ ستمبر کا افسوسناک واقعہ پیش آیا۔ اور اس کی وجہ سے دنیا کی توجہ پاکستان اور افغانستان کی طرف مبذول ہو گئی۔ اُس وقت میں ایک اخبار میں کام کرتی تھی اور مجھے یہ اعزاز حاصل تھا کہ میں کراچی میں پیدا ہوئی اور میں نے امریکہ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ایک ایسے فرد کی حیثیت سے جو دونوں دنیاؤں کو بخوبی سمجھ سکتا ہو، میرا یہ خیال تھا کہ میں مشرق کی معلومات مغرب کو منتقل کر کے تعمیری کام کر سکوں گی۔ دستاویزی فلم سازی مواد کے اعتبار سے ایک سوچنی سمجھی تبدیلی تھی۔ جسے میں نے اپنا مقصد

Please describe your role in media. Include a description of how your work gets done on a daily basis.

Over the last three years, I have been working extensively in Pakistan through my company SOC Films. We are a documentary production house and are currently working on a number of projects for which I am back and forth between Pakistan, Bangladesh and America. I am also currently wrapping up two feature films: Sounds of Sachal, a documentary film about a jazz ensemble in Lahore that is trying to revive classical music locally, and Peacekeepers, a film about Bangladeshi policewomen who are serving as peace-keeping forces in Haiti with the UN.

Last year, SOC Films partnered with ARY Films to create a

ازراہ کرم ذرائع ابلاغ میں اپنے کردار پر روشنی ڈالنے اور بتانے کے لئے آپ روزمرہ کا کام کیسے نمٹاتی ہیں؟

گذشتہ تین برس سے میں پاکستان میں اپنی کمپنی ایس او سی فلمز کے لئے کام کر رہی ہوں۔ ہم ایک ڈاکومنٹری پروڈکشن ہاؤس ہیں اور بہت سے منصوبوں پر کام کر رہے ہیں۔ مجھے ان کاموں کے سلسلے میں پاکستان، بنگلہ دیش اور امریکہ کے درمیان سفر میں رہنا پڑتا ہے۔ میں اس وقت دو فیچر فلمیں تیار کرنے میں بھی مصروف ہوں۔ ”ساؤنڈز آف سچل“ ان جاز موسیقاروں کے بارے میں ایک دستاویزی فلم ہے جو لاہور میں جمع ہو کر مقامی طور پر کلاسیکی موسیقی کو زندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور دوسری فلم ”پیس کیپرز“ ان بنگلہ دیشی خواتین پولیس اہلکاروں کے بارے میں ہے جو ہیٹی میں اقوام متحدہ کی امن فوج کا حصہ رہیں۔

new production house by the name of Waadi Animations. It will solely produce animated content. We are currently in the final stages of producing 3 Bahadur, Pakistan's first animated feature! I've been incredibly busy with that – we are creating games, comic strips and books, as well as conducting a school outreach tour where we will be traveling across the country to screen clips from the movie and encourage children to use their abilities to inspire change in their communities.

How did you come into this role? (Life long dream? Educational background? Career switch?)

My interest in documentary filmmaking and narrative-based story telling was sparked in 2001, when the tragic events of September 11th

shifted the world's focus to Afghanistan and Pakistan. I was a print journalist at that time, and had had the privilege of growing up in Karachi, and being educated in the United States. As someone who could successfully understand both worlds, I thought that I could play a constructive role in relaying information from the East to the West. Documentary filmmaking was an organic shift in terms of the content that I was trying to capture; film has a way of bridging differences and providing visceral accounts of situations that may seem foreign or unimaginable in print.

Shortly thereafter, I made my first film, "Terror's Children," which was about Afghan refugee children living in Karachi. That experience taught me that there is always more to the story than what makes it to the evening news, or what graces our headlines the next day, and that those stories are the ones that need to be explored in order for us to understand conflict as a social and real thing, rather than an abstract idea. This sentiment has guided my career as a filmmaker, and has established a theme of sorts; I go after stories that give a voice to those that are not usually given the opportunity to speak for themselves.

Describe how you feel your work impacts others.

Many of my films have been used by non-profits and activists to create social awareness and raise funds. Most recently, I worked on a five-part documentary series called "I Heart Karachi" which celebrated ordinary people doing extraordinary work in one of the most dangerous cities in the world. We ran public screenings of the films and took it to schools all over Karachi and the response we got was heartwarming. I find it amazing that these individuals risk their lives for us every single day yet we know so little about them and

پورا کرنے کی ایک کوشش کے طور پر اپنا یا۔ فلم میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے ایک دوسرے سے مختلف امور کو باہم جوڑا جاسکتا ہے اور صورت حال کا ایک ایسا شعوری منظر نامہ تشکیل دیا جاسکتا ہے۔ جسے اخبار میں شائع کرنا شاید ممکن نہ ہو۔

اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد میں نے اپنی پہلی فلم "میررز چلڈرن" تیار کی جو کہ کراچی میں رہنے والے افغان پناہ گزین بچوں کے بارے میں تھی۔ اس تجربے نے مجھے یہ سکھایا کہ شام کے وقت تیار ہونے والی یا اگلے روز سرخی بننے والی کسی بھی خبر کے پیچھے مزید بہت کچھ کہنے کا ہوتا ہے۔ اور یہ کہ بہت سی کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جنہیں اس مسئلے یا تنازعے کو ایک مجرد خیال سمجھ کر چھوڑنے کے بجائے زیادہ گہرائی سے جاننا اس کے سماجی اور حقیقی تناظر میں سمجھنے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اس احساس نے مجھے فلم ساز کے طور پر اپنا کیریئر بنانے میں مدد دی اور میری راہ متعین کی۔ میں ایسی کہانیوں کی تلاش میں رہتی ہوں جن کے ذریعے ان لوگوں کی آواز سنی جاسکے جنہیں عام طور پر اپنے طور پر بولنے کا موقعہ نہیں ملتا۔

یہ بتائیے کہ آپ کا کام دوسروں کو کیسے متاثر کرتا ہے؟

میری بہت سی فلموں کو غیر منافع بخش اور سماجی کام کرنے والوں نے عوامی شعور بیدار کرنے اور کسی اچھے مقصد کے لئے عطیات جمع کرنے کے لئے استعمال کیا۔ حال ہی میں، میں نے پانچ حصوں پر مشتمل ایک دستاویزی فلم "میں کراچی کا دل" پر کام کیا۔ جس میں دنیا کے خطرناک شہروں میں سر فہرست کراچی کے ایسے عام شہریوں کی خدمات کو سراہا گیا جو غیر معمولی کام کر دکھاتے ہیں۔ ہم نے یہ فلمیں عام لوگوں کو دکھائیں اور انہیں اسکولوں میں لے کر گئے۔ ہمیں جو پذیرائی حاصل ہوئی، اس سے ہمارے حوصلے اور زیادہ بلند ہوئے۔ یہ بات بہت حیران کن تھی کہ اگرچہ ہم

their work. I want to highlight such heroes so that the world can celebrate their bravery and appreciate their commitment in tackling violent extremism through positive action.

What do you feel is your greatest accomplishment working in media so far?

I am currently working on an animated feature film for children in Pakistan by the name of 3 Bahadur. This promises to be Pakistan's first animated feature, but, more importantly, Pakistani children will finally be able to see characters who look like them and talk like them on the big screen. The film is about three friends who, equipped with superpowers, set out on a journey to save their town from the evils that plague it. Given the demographics of Pakistan, one would imagine that we would be producing far more content that is specifically geared towards children. Pakistan has one of the youngest populations in the world with about 42 percent of people under the age of 14, yet there is virtually no original children's programming in theatres or television in the country. In a world of Dora's, Ben 10's and Chota Bheems, the fact that we are giving our children local mentors and heroes is one of my proudest accomplishments. The film is due to release in the summer of 2015

How does what you do shape the American narrative and/or shape American culture?

Film has a way of revealing not only the soul of each person you see onscreen, but also the core of an issue that might otherwise be seen as a mere headline or statistic. I want my films to serve as vessels of information that connect audiences, prompt dialogue, and initiate social change. I view my films as active stories that come to life when they are viewed and discussed – the film is oftentimes just the first step in a much more vast and fruitful conversation.

ان لوگوں کے کام اور خود ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے تھے لیکن اس کے باوجود ان افراد نے ہماری خاطر روزانہ اپنی جانوں کو خطرے میں ڈالا۔ میں ان ہیروز کی زندگی منظر عام پر لانا چاہتی تھی تاکہ دنیا ان کی بہادری سے آگاہ ہو سکے اور جان سکے کہ کس طرح سے خوریز انتہا پسندی سے مثبت انداز میں نبرد آزما ہو جاسکتا ہے۔

میڈیا میں کام کرتے ہوئے آپ اب تک کس کام کو اپنی سب سے بڑی کامیابی سمجھتی ہیں؟

میں اس وقت پاکستانی بچوں کے لئے 3 بہادر کے نام سے ایک اینی میڈیٹڈ فلم تیار کر رہی ہوں۔ یہ پاکستان کی پہلی اینی میڈیٹڈ فلم ہوگی لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ پاکستان کے بچے پہلی بار بڑی سکرین پر ایک ایسی فلم دیکھ سکیں گے جس کے کردار ان کی اپنی طرح بات چیت کرتے اُٹھتے بیٹھتے دکھائی دیں گے۔ یہ فلم ایسے تین دوستوں کے بارے میں ہے۔ جنہیں مافوق الفطرت طاقت حاصل ہوتی ہے اور وہ اپنے شہر کو دشمنوں سے بچانے کی مہم پر نکلتے ہیں۔ پاکستان کی آبادی کے اعداد و شمار کو دیکھا جائے تو یہ خیال ہوگا کہ یہاں بچوں کے لئے زیادہ فن پارے تیار کئے جارہے ہوں گے۔ دنیا میں نو عمر ترین آبادی رکھنے والے ممالک میں پاکستان سرفہرست ہے۔ یہاں کی 42 فیصد آبادی کی عمر چودہ برس سے کم ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ملک کے تھیٹریاٹلی ویژن پر بچوں کے لئے مخصوص کوئی الگ سے پروگرام سے سے موجود ہی نہیں۔ Dora's, Ben 10's, Chota Bheems جیسی فلموں کی دنیا میں ہم جب اپنے بچوں کو مقامی ہیرو اور سرپرست دے رہے ہیں تو میں اسے اپنی سب سے بڑی اور قابل فخر کامیابی سمجھتی ہوں۔ یہ فلم سال رواں کے وسط تک ریلیز کر دی جائے گی۔

آپ امریکی ثقافت اور یا امریکی داستان گوئی کے اسلوب اور خدو و خال کو کیسے ترتیب دینا چاہیں گی؟

فلم ایک ایسا ذریعہ ہے جس میں نہ صرف آپ

For example, the attention that the Muslim world was getting from the Western media after 9/11 pushed me to become an adequate representative. I felt it was my responsibility to speak out about issues in the East in a way that the West would understand. My film "Pakistan's Taliban Generation" forces the world to look at a toxic phenomenon from a humanistic perspective; how the war on terror is impacting children in Pakistan.

What are the general challenges of working in the media environment today?

Speaking specifically about animation in Pakistan, the hardest parts were definitely in the beginning especially since none of us had worked in animation before. It was an uphill climb - putting together a team, learning how animation works from the initial sketch to the final shot, and diving into a medium that is both expensive and time consuming.

Unfortunately in animation, unlike films, the amount you spend is directly related to the quality that you can achieve. Pakistani animators are skilled enough to produce content that mirrors Pixar in terms of quality, but you need the budgets and timelines that will support such work. We haven't done our animators justice in this country, and have not given them the space and resources required to show off just how talented they are. 3 Bahadur is a step in the right direction, but we still have a long way to go.

Do you believe that being a woman affects your work? Why or why not?

Pakistan is now officially one of the most dangerous countries in the world for journalists to work in. But being a woman is overwhelmingly an asset in my field more than it is a hindrance. I am alive today because I am a woman. I think women have a special way of navigating through Pakistan and people here

سکرین پر دکھائی دینے والے ہر فرد کی روح کو اندر تک دیکھ سکتے ہیں بلکہ کسی بھی ایسے مسئلے کی تہہ تک پہنچ سکتے ہیں جسے دوسری طرف محض ایک شہ سرنخی یا اعداد و شمار سمجھا جاتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میری فلمیں معلومات کا ایک ایسا ذریعہ بنیں جو ناظرین کو آپس میں جوڑ دیں۔ فوری طور پر بات چیت، گفت و شنید اور ایک سماجی تبدیلی کے آغاز کا باعث بنیں۔ میں اپنی فلموں کو ایسی متحرک کہانیاں سمجھتی ہوں جو دیکھے جانے اور ان پر بات چیت کے نتیجے میں زندہ ہو جاتی ہیں۔ اکثر اوقات فلم کسی بھی وسیع اور با معنی مذاکرات کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔

مثال کے طور پر 9/11 کے واقعے کے بعد مغربی ذرائع ابلاغ نے مسلم دنیا میں جس قدر دلچسپی لی۔ اس نے مجھے ایک موزوں نمائندہ بننے پر مجبور کیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ میری ذمہ داری بنتی ہے کہ مشرق کے مسائل کے بارے ایسے انداز میں بات کروں کہ مغرب سمجھ سکے۔ میری فلم Pakistan's Taliban Generation نے دنیا کو مجبور کیا کہ وہ ایک زہر آلود مسئلے کے انسانی پہلوؤں کو بھی دیکھے۔ کہ کس طرح سے دہشت گردی کے خلاف جنگ پاکستانی بچوں کو متاثر کر رہی ہے۔

آج کل کے ماحول میں ذرائع ابلاغ میں کام کرنے میں کون سے عام چیلنج درپیش ہوتے ہیں؟

اگر میں پاکستان میں خاص طور پر اپنی میشن کی بات کروں تو یہ کہنا چاہوں گی کہ اس کا آغاز سب سے زیادہ مشکل تھا کیونکہ ہم میں سے کسی نے بھی اپنی میشن پر کام نہیں کیا تھا۔ ایک ٹیم بنانا، اور یہ جاننا کہ ایک خاکے سے شروع ہونے والی اپنی میشن کا اختتام کیسا ہوگا۔ اور اسے ایک ایسے ذریعے میں ڈھالنا جو بیک وقت مہنگا اور بہت وقت لینے والا ہے۔ پہاڑ کی چوٹی سر کرنے جیسا مشکل کام تھا۔

بد قسمتی سے فلموں کے برعکس اپنی میشن میں آپ

have a great deal of respect for female journalists. As a woman, I am also able to work in communities that observe strict division based on gender, as I am able to speak with and film women. Being a native Pakistani also has a large role in making people comfortable – it is important for your character to trust you with their story.

What is your advice to other young women eager to play a role in media?

Women can be united in the fact that there has always been someone in our lives who has told us "it can't be done" or "there is only so much you can do." We are constantly encouraged to think that being born a woman means we were born with limited choices and compromised dreams.

I became a documentary filmmaker because I wanted to make socially conscious films. I never studied filmmaking and, in fact, I didn't even know what a director's role was. But I used the internet to teach me things, I wrote about 80 film proposals, mailed them out and waited. I received so many rejections that I lost count. But with each 'no', I knew there would be a 'yes' somewhere - there had to be a door that I had not yet knocked upon. And there was. One day, an email I wrote came back with a positive response. Ten years later, I was making an acceptance speech at the Oscars and all I kept thinking was thank God I kept knocking! My advice to young women eager to play a role in media would be just that – keep knocking! Never take no for an answer – use whatever resources are available to you and continue to practice and persevere. Whether it is using your cell phone instead of a fancy camera, or submitting a short film to a local festival, do the best with what you have. Spend time learning and perfecting your craft, and don't let your ego get the best of you. Never say no to a potential opportunity – you never know where it may lead you. ■

جس قدر زیادہ رقم خرچ کریں گے اسی قدر بہتر نتائج حاصل ہوں گے۔ پاکستان کے اپنی میٹرز اتنے باصلاحیت ہیں کہ وہ انتہائی اچھے معیار کی فلمیں تیار کر سکتے ہیں لیکن اس کے لئے آپ کے پاس درکار وسائل اور وقت بھی ہونا لازم ہے۔ ہم اپنے ملک کے اپنی میٹرز کے ساتھ انصاف نہیں کر رہے۔ ہم نے وہ وسائل اور وقت انہیں نہیں دیا جو اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرنے کے لئے نہیں درکار تھا۔ 3 بہادر درست سمت میں ایک قدم ہے لیکن ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔

کیا آپ کے خیال میں خاتون ہونے کے ناطے آپ کا کام متاثر ہوتا ہے؟ اگر نہیں ہوتا تو کیوں اور اگر ہوتا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟

اس وقت پاکستان کو صحافیوں کے لئے دنیا میں سب سے زیادہ خطرناک ملک قرار دیا جا چکا ہے۔ لیکن اپنے شعبے میں ایک خاتون کے طور پر کام کرنا میرے لئے رکاوٹ کے بجائے ایک اثاثہ ہے۔ آج اگر میں زندہ ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک خاتون ہوں۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان میں خواتین کو ایک خاص مقام حاصل ہے اور یہاں کے لوگ خواتین صحافیوں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ایک عورت ہونے کے ناطے میں ایسی آبادیوں میں آسانی سے چلی جاتی ہوں جہاں عورتوں کو مردوں کے ساتھ گھٹنے ملنے کی آزادی نہیں ہوتی۔ میں ان عورتوں کے پاس جا کر ان کی فلم بندی کر سکتی ہوں۔ میرا پاکستان کی شہری ہونا بھی لوگوں کے لئے باعث اطمینان ہوتا ہے۔ یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے کہ آپ کے کردار اپنی کہانی سنانے کے لئے آپ پر اعتماد کرتے ہوں۔ ■



کام کر کے سیکھیں:

امریکی فری لانس دستاویزی فلم ساز
طلحہ ہداوی سے انٹرویو

LEARN BY DOING:

Interview with Tala Hadavi

Freelance Documentary Filmmaker, U.S.

Please describe your role in media. Include a description of how your work gets done on a daily basis.

I am a freelance documentary filmmaker and video journalist, which basically means that I work as an independent 360-degree storyteller. I pitch story ideas, conceptualize, research, shoot, edit, write, and produce – all on my own. This job has its ups and downs and more than anything, can be very lonely at times. As of late, I've become more interested in picking up projects that have a fellow storyteller.

No day is like the other. Depending on what project I'm working on or what phase of a project I am in, I could be editing in the morning and then off to a shoot in the afternoon on an entirely different project. I love it this way because it keeps me on my toes and it's never a dull moment.

How did you come into this role? (Life long dream? Educational background? Career switch?)

I actually studied business in undergrad and economics/international development in grad school. My plan was to work in international

ازراہ کریم ذرائع ابلاغ میں اپنے کردار پر روشنی ڈالنے اور بتانے کے لیے کہ آپ روزمرہ کا کام کیسے نمٹاتی ہیں؟

میں ایک فری لانس دستاویزی فلم ساز اور ویڈیو جرنلسٹ ہوں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ میں مکمل طور پر خود مختار کہانی کار کے طور پر کام کرتی ہوں۔ میں کہانی کا تانا بانا بنتی ہوں۔ اس پر سوچتی ہوں۔ تحقیق کرتی ہوں۔ اُسے فلماتی ہوں۔ اُس کی تدوین کرتی ہوں۔ لکھتی ہوں اور تیار کرتی ہوں۔ یہ سب کام میں اکیلے سرانجام دیتی ہوں۔ اس کام کے اپنے اتار چڑھاؤ ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بسا اوقات تنہائی کا احساس بہت شدت سے ستاتا ہے۔ اب تو میں ایسے منصوبوں میں زیادہ دلچسپی لیتی ہوں جن میں ایک ساتھی کہانی سنانے والا بھی ہو۔

ہردن دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ کام کی نوعیت کے مطابق بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ صبح کے وقت میں ایک فلم کی تدوین کرتی ہوں تو شام کے وقت کسی بالکل مختلف فلم کی شوٹنگ کر رہی ہوتی ہوں۔ مجھے ایسا کرنا اچھا لگتا ہے کیونکہ اس طرح سے میں ہمیشہ متحرک رہتی ہوں۔ اور کوئی لمحہ بھی ضائع نہیں ہوتا۔

آپ نے یہ کام کیسے اپنایا؟ (کیا یہ آپ کی دلی خواہش تھا؟ آپ کا تعلیمی پس منظر ایسا کا تھا؟ یا آپ نے اپنا پیشہ خود تبدیل کیا؟)

میں تو کالج میں پہلے بزنس اور اورگریجویٹ کے دوران میں معاشیات/بین الاقوامی ترقی کے مضامین پڑھ رہی تھی۔ میں بین الاقوامی ترقی اور غربت کے خاتمے کے لئے کام کرنے کی خواہاں تھی اور کالج سے فارغ ہونے کے بعد تین برس تک میں نے عالمی بینک میں کام کیا۔ یہ بہت اچھا تجربہ رہا لیکن جب میری ایک دوست نے وائس آف امریکہ میں ایک اسامی کا بتایا تو مجھے اپنی ملازمت چھوڑنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی۔ شروع میں میرا خیال نہیں تھا کہ میں ہمیشہ اسی شعبے میں رہوں گی لیکن اب پانچ برس گزرنے کے بعد مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں اس شعبے میں ہی رہوں گی۔ حقیقت

development and poverty reduction and I worked at the World Bank for three years after grad school. It was a great experience, but when a friend told me about an opening at Voice of America, I didn't hesitate. I didn't think it was going to last forever, but now, five years later, I think I'll grow old in this field. I truly enjoy my work.

Describe how you feel your work impacts others.

Over the past five years, I've free-lanced in various capacities for the Persian Service at Voice of America. It's been an incredibly humbling and rewarding experience for various reasons. One is the daily interaction and feedback from my audience. They send me



feedback, questions, criticism on social media and it has provided me great understanding of what their needs and interests are. I have based a lot of my pitches on their responses. It has shaped my work to want to pursue stories that keep them engaged and informed. Many Iranians don't have the access to the travel and exposure that we take for granted here in the west, so I've feel it's my duty to provide a glimpse into life here.

What do you feel is your greatest accomplishment working in media so far?

I would say it was following an Iranian-Swedish Ultimate Fighting Championship fighter for seven weeks in Sweden and Brazil while he was preparing for his biggest fight yet. The travel in production had its ups and downs. It was a lot of fun but really intense, long hours, and rather lonely at times.

The work in post-production was exhausting but the fruit of all the work was in the responses I got from the audience. I got thousands of messages telling me how much the story had inspired them to push harder and never give up. It ended up being broadcasted in 45 countries and in three languages. It was really special and is one of the highlights of my career to date.

How does what you do shape the American narrative and/or shape American culture?

Well, I would say quite a lot. I have worked on a lot of Americana shows telling the human side of news stories. I think what people are interested in, isn't so much the daily grind of the new cycle, but more in the American narrative – for example, how did the recent protests in Ferguson, Missouri impact the people living there? How did the BP oil spill change the livelihood of people working in the fisheries? How are people recovering from Hurricane Sandy two years later? That's what people care about and are inspired by. That's a part of the new American culture that is being shaped in 2015. That's especially more interesting to those living outside of the United States.

یہ ہے کہ میں اپنے کام سے بہت مطمئن ہوں۔

یہ بتائیے کہ آپ کا کام دوسروں کو کیسے متاثر کرتا ہے؟

گزشتہ پانچ برسوں میں، میں نے واٹس آف امریکہ کی فارسی نشریات میں کئی عہدوں پر فری لانس کی حیثیت سے کام کیا ہے۔ بہت سی وجوہات کی بنا پر یہ ناقابل یقین حد تک اطمینان بخش تجربہ رہا۔ سب سے پہلی اہم بات یہ کہ مجھے اپنے سامعین و ناظرین کے ساتھ روزانہ رابطے میں رہنے اور ان کی آراء جاننے کا موقع ملتا ہے۔ وہ مجھے سوشل میڈیا پر اپنی رائے، سوالات اور تنقید بھیجتے ہیں اور یوں مجھے یہ جاننے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ ان کی ضروریات اور توقعات کیا ہیں۔ میں نے ان کی آراء کو اپنی کئی کہانیوں کی بنیاد بنایا ہے۔ میں ایسی کہانیوں پر کام کرنا چاہتی ہوں جو انہیں پسند ہوں اور انہیں باخبر رکھیں۔ بہت سے ایرانیوں کو سفر اور معلومات تک رسائی کی وہ سہولیات حاصل نہیں جنہیں ہم مغرب میں مفت ہاتھ آئی شے سمجھتے ہیں۔ اس لئے میں انہیں یہاں کی زندگی کے بارے میں آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔

میڈیا میں کام کرتے ہوئے آپ اب تک سب سے بڑی کامیابی سمجھتی ہیں؟

یہ ایک ایرانی نژاد سویڈش فائٹنگ Ultimate Fighting Championship میں شرکت کے حوالے سے سویڈن اور برازیل میں تیار کی گئی سات ہفتوں پر مبنی سرگرمیوں کی فلم بندی تھی۔ جو اپنی سب سے بڑی لڑائی کی تیاری کر رہا تھا۔ اس دستاویزی فلم کی تیاری کے لئے اختیار رکھے جانے والے سفر میں کئی اٹار چڑھاؤ آئے۔ خوشی اور مسرت سے بھرے اس سخت کام میں گھنٹوں صرف ہوتے اور بعض اوقات تنہائی کا احساس بہت شدید ہوتا تھا۔ فلم بندی کے بعد کا کام تھا دیکھنے والا تھا لیکن سامعین و ناظرین نے جس رد عمل کا اظہار کیا وہ میرا سب سے بڑا انعام تھا۔ مجھے ہزاروں کی تعداد میں پیغامات آئے جن میں کہا گیا تھا کہ اس کہانی نے انہیں ہارنہ ماننے اور سخت محنت کرنے کا سبق دیا ہے۔ یہ فلم تین زبانوں میں پینتالیس ملکوں میں دکھائی گئی۔ یہ بہت ہی خاص کام تھا اور میرے اب تک کے کیریئر میں سب سے نمایاں ہے۔

آپ امریکی ثقافت اور یا امریکی داستان گوئی کے اسلوب اور خدو خال کو کیسے ترجیح دینا چاہیں گی؟

میرے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔ میں نے امریکانکا شو پر کام کرتے ہوئے خبروں کی کہانیوں کے انسانی پہلوؤں پر بہت بار بات کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ لوگ روزمرہ زندگی کی خبروں میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ وہ امریکہ کے اسلوب بیان کے بارے میں زیادہ حساس ہیں مثلاً حال ہی میں میزوری کے شہر فرگوسن میں ہونے والے احتجاج نے وہاں بسنے والے لوگوں کی زندگی کو کس طرح سے متاثر کیا ہے؟ کس طرح سے بی بی تیل کے اخراج سے مانی پروری میں کام کرنے والوں کے روزگار میں تبدیلی پیدا ہوئی ہے؟ کس طرح سے لوگ سمندری طوفان سینڈی کے دو برس بعد اپنے معمولات زندگی بحال کر رہے ہیں؟ یہ وہ باتیں اور کام ہیں جن سے لوگوں میں جوش و جذبہ پیدا ہوتا ہے اور جن کے بارے میں وہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ اس امریکی ثقافت کی نئی صورتیں ہیں جو 2015ء میں رواج پاری ہے۔ یہ سب کچھ

What are the general challenges of working in the media environment today?

The general challenge is that because of social media, people “know” a lot more and a lot faster. There are so many so-called “citizen journalists” with smart phones that will post un-sourced “news” within seconds of it happening. In many situations it’s amazing. It has changed the way we engage and understand. It has given a platform to anyone to have a voice. These are all great things.

However, it effectively challenges the work of those that want to put more time and effort into telling the narrative, and those that have to follow standards of double and triple sourcing. For documentary filmmakers, it’s risky to put months or even a year into making something of substance, because we don’t know whether or not people will take the time to watch a 53-minute film, as opposed to reading a tweet of 140 characters. By the time the news story or feature comes out, people have moved on to the next “story.”

Do you believe that being a woman affects your work? Why or why not?

Absolutely - in several ways. For one, I am more emotional and a caregiver at heart. When I was in Jordan two months ago, I spent a week in various Syrian refugee camps around the country. It was tough. Even though I try my best to separate my emotions from my work, I can’t. I want to spend a little extra time with the kids, ask them questions about how they are and how they see their futures. It takes a lot to be able to just move on or speed things up. It’s important to be professional, neutral and honest to your audience as a journalist, but I would be lying if I said telling the stories of people’s anguish and devastation is just a job. It not only makes me work differently on the field but the end product ends up being different as well.

Being a woman also affects my job in how people treat me. Employers look at me differently when they are trying to determine whether or not I can go on a challenging assignment. On the other hand, once I am on the field, I find that subjects feel more compelled or comfortable speaking to me, because I approach them differently than a male would. I listen and respond differently. Like anything else, being a woman in media has its positives and negatives, but I love it and wouldn’t change it for anything.

What is your advice to other young women eager to play a role in media?

Watch the news a lot. Practice making news stories on your own, and practice telling the stories of characters in your own community. Write a lot. Use your phone to shoot videos. Edit that footage on editing apps or software. Blog. Be engaged in social media and follow those you find interesting and those you feel you can learn from. See how they work. Imitate their work. And finally if you’re studying journalism at a university, apply for internships. Do internships! I can’t emphasize that enough! Network and meet with people you admire. Ask them how they did it. If you can’t go to a university, just practice and stay informed on subjects you find interesting and then blog and write about it. Create an audience, a voice and a platform. Receive feedback and then do better based on constructive criticism. There is so much information out there that you can learn how to do this job without formal schooling in journalism. You can learn by doing. ■

امریکہ سے باہر رہنے والوں کے لئے خاص طور پر دلچسپی کا باعث ہے۔

آج کل کے ماحول میں ذرائع ابلاغ میں کام کرنے میں کون سے عام چیلنج درپیش ہوتے ہیں؟

عام چیلنج تو یہ ہے کہ اب لوگ سوشل میڈیا کی وجہ سے بہت کچھ بہت تیزی سے جاننے لگے ہیں۔ بہت سے لوگ “شری صحافیوں” کے طور پر کام کرنے لگے ہیں جو سمارٹ فونز کی مدد سے کسی بھی واقعے کی “خبر” بغیر کسی حوالے کے چند سیکنڈ کے اندر پوسٹ کر دیتے ہیں۔ کئی اعتبار سے تو یہ بہت حیران کن ہوتا ہے۔ لیکن اس سے ہمارے کسی کام میں شریک ہونے اور اُسے سمجھنے کا سارا عمل تبدیل ہو گیا ہے۔ اس سے ہر کسی کو اپنی آواز بلند کرنے کے لئے پلیٹ فارم میسر آ گیا ہے۔ یہ سب بہت شاندار چیزیں ہیں۔

تاہم اس رجحان نے اُن لوگوں کے کام کے لئے کئی چیلنج پیدا کر دیئے ہیں جو کسی کہانی کو سنانے میں زیادہ وقت اور کوششیں صرف کرنا چاہتے ہیں اور جو دوسرے اور تہرے ذرائع کا معیار اپنانے رکھنا چاہتے ہیں۔ دستاویزی فلم سازوں کے لئے تو یہ بہت بڑا خطرہ مول لینے کے مترادف ہے کہ ہم کوئی اہم فلم تیار کرنے میں مہینوں بلکہ سال بھر لگیں رہیں۔ کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ آیا لوگ 140 الفاظ پر مشتمل ٹویٹ پڑھنے کے مقابلے میں تین منٹ کی دستاویزی فلم دیکھنا چاہیں گی یا نہیں۔ جتنی دیر میں کسی خبر کی کہانی منظر عام پر آتی ہے۔ اُس وقت تک لوگ ایک نئی “کہانی” کی طرف متوجہ ہو چکے ہوتے ہیں۔

کیا آپ کے خیال میں خاتون ہونے کے ناطے آپ کا کام متاثر ہوتا ہے؟ اگر نہیں ہوتا تو کیوں اور اگر ہوتا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟

یقیناً بہت سے حوالوں سے ایسا ہوتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں دل سے ہر کسی کا خیال رکھتی ہوں اور بہت جذباتی بھی ہوں۔ دو ماہ پہلے میں اردن میں تھی اور میں نے ایک ہفتہ ملک بھر میں پھیلے ہوئے شامی پناہ گزینوں کے کیڑوں میں گزارا۔ یہ وقت بہت مشکل تھا۔ اگرچہ میں نے پوری کوشش کی کہ میں اپنے جذبات کو اپنے کام سے علیحدہ رکھ سکوں لیکن میں ایسا نہ کر پائی۔ میں بچوں کے ساتھ کچھ زیادہ وقت گزارنا چاہتی تھی اور اُن سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ کیسے ہیں اور اپنے مستقبل کو کیسا دیکھتے ہیں۔ وہاں صرف آگے بڑھنے اور کام نمانے کے لئے بہت کچھ کرنا پڑتا تھا۔ ایک صحافی کی حیثیت سے غیر جانبدار، پیشہ ور اور دیانت دار ہونا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن اگر میں یہ کہوں کہ لوگوں کے مصائب، ذہنی عذاب کی کیفیت اور تباہی کی داستانیں سنانا صرف ایک پیشہ ہے تو یہ جھوٹ ہوگا۔ اس سفر نے صرف میرے کام کرنے کے انداز کو تبدیل کیا بلکہ جو فلم تیار ہوئی وہ بھی یکسر مختلف نوعیت کی تھی۔

ایک خاتون ہونے کے ناطے میرے ساتھ لوگوں کا برتاؤ بھی میرے کام کو متاثر کرتا ہے۔ میرے آجرب اس بات کا تعین کرنے لگتے ہیں کہ آیا میں اس مشکل کام کو کر پاؤں گی یا نہیں تو وہ مجھے مختلف نظروں سے دیکھتے ہیں۔ جب میں میدان عمل میں ہوتی ہوں تو مجھ سے بات کرتے ہوئے لوگ بہت آسانی محسوس کرتے ہیں کیونکہ میں مردوں کے مقابلے میں کچھ مختلف انداز میں اُن سے رابطہ کرتی ہوں۔ میرا سننے اور جواب دینے کا طریقہ مختلف ہے۔ ہر شے کی طرح ایک خاتون ہونے کے ناطے ذرائع ابلاغ میں کام کرنے کے بھی مثبت اور منفی پہلو ہیں۔ لیکن میں اپنے کام کو پسند کرتی ہوں اور اسے کسی بھی قیمت پر تبدیل نہیں کروں گی۔

ذرائع ابلاغ میں کام کرنے کی خواہش مند دوسری لڑکیوں کو آپ کی مشورہ دینا چاہیں گی؟

زیادہ سے زیادہ خبریں دیکھیں۔ خبریں تیار کرنے اور انہیں اپنے ارد گرد کے لوگوں کو سنانے کی مشق کریں۔ بہت لکھیں۔ ویڈیوز تیار کرنے کے لئے اپنا فون استعمال کریں۔ اپنی تیاری ہوئی ویڈیوز کی تدوین کے لئے Editing Apps یا سافٹ ویئر استعمال کریں۔ بلاگ پر کام کریں، سوشل میڈیا پر مصروف رہیں اور ایسے لوگوں کے ساتھ رابطے میں رہیں جو آپ کو دلچسپ لگیں یا جن سے آپ کچھ سیکھ سکیں۔ دیکھیں کہ وہ کیسے کام کرتے ہیں۔ اُن کے کام کی تقلید کریں۔ اور آخری بات یہ کہ اگر آپ کسی یونیورسٹی میں صحافت پڑھ رہی ہیں تو انٹرن شپ کے لئے درخواستیں دیں۔ انٹرن شپ کا موقع ملے تو لیں اس پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہے۔ جن لوگوں کو آپ پسند کرتے ہیں اُن کے ساتھ تعلق بنائیں اور میل جول رکھیں۔ اُن سے پوچھیں کہ انہوں نے یہ کام کیسے کیا۔ اگر آپ یونیورسٹی نہیں جاتیں تو اپنی مشق جاری رکھیں۔ جن حالات و واقعات میں آپ کی دلچسپی ہو۔ اُن کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش کریں۔ پھر اس بارے میں اپنا بلاگ لکھیں۔ اپنے ناظرین بنائیں، اپنی آواز اُن تک پہنچانے کے لئے ایک پلیٹ فارم وضع کریں۔ لوگوں کی آراء حاصل کریں اور اُن کی تنقید کی روشنی میں اپنے کام کو مزید بہتر بنائیں۔ صحافت کے شعبے میں تعلیم حاصل کئے بغیر اس کام کو کرنے کے حوالے سے بے شمار معلومات دستیاب ہیں۔ آپ یہ کام کئے کچھ سکتی ہیں۔ ■



WOMEN ARE EQUAL, AND SOMETIMES, EVEN BETTER

خواتین برابر ہیں، بسا اوقات تو بہتر ہوتی ہیں

By Ann Hartman
Seminars Specialist, East-West Center, U.S.

The East-West Center has been working with journalists in Pakistan since 1969, and since then, a variety of strong and well-positioned women journalists have participated in our programs. In 2011, the Center increased these efforts through a Pakistan-U.S. Journalists Exchange program funded by a grant from the U.S. Embassy Islamabad Public Affairs section. The program brought Pakistani journalists to the United States and American journalists to Pakistan for 10-day study tour visits. The two groups met at the East-West Center in Honolulu before and after their study tours. The goal was to promote the important role of media in a democracy and to help bridge the gaps in understanding between the U.S. and Pakistan.

This past October, at an alumni conference of the East-West Center's media programs in Pakistan, groups of journalists were asked to describe the world of a journalist in 2025. For one group, anchored by three dynamic women and one man, the key characteristic of that journalist was that she would be a female. In their future world, Pakistani newsrooms would be more diverse and more equal, with

تحریر: این ہارٹمن

سمینارز سپیشلسٹ، ایسٹ ویسٹ سینٹر

ایسٹ ویسٹ سینٹر 1969ء سے پاکستانی صحافیوں کے ساتھ کام کر رہا ہے اور اس وقت سے بہت سی مضبوط اور اچھے عہدوں پر فائز صحافی خواتین نے ہمارے پروگراموں میں شرکت کی ہے۔ 2011ء سے اس سینٹر نے اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے کے شعبہ امور عامہ کی طرف سے پاکستان۔ یو ایس جرنلسٹس ایکسچینج پروگرام کے لئے ایک گرانٹ موصول ہونے کے بعد سے اس سلسلے میں اپنی کوششیں تیز کر دی ہیں۔ اس پروگرام کے تحت پاکستانی صحافیوں کو امریکہ اور امریکی صحافیوں کو پاکستان کا دس روزہ مطالعاتی دورہ کرایا جاتا ہے۔ یہ دونوں گروپ اپنا مطالعاتی دورہ شروع کرنے سے پہلے اور بعد میں ہونولولو میں ایسٹ ویسٹ سینٹر میں ملاقات کرتے ہیں۔ اس ملاقات کا مقصد پاکستان اور امریکہ کے درمیان ایک دوسرے کو سمجھنے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کرنا اور جمہوریت میں ذرائع ابلاغ کے اہم کردار کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہوتا ہے۔

گزشتہ اکتوبر میں پاکستان کے لئے ایسٹ ویسٹ سینٹر کے میڈیا پروگراموں کی ایک ایلو بیٹائی کانفرنس میں صحافیوں کے گروپوں سے کہا گیا کہ وہ بتائیں کہ 2025ء کا صحافی کیسا ہوگا۔ ایک گروپ کے نزدیک جس میں تین خواتین اور ایک مرد شامل تھے، اس صحافی کی سب سے بنیادی خوبی یہ ہوگی کہ وہ ایک خاتون ہوگی۔ مستقبل کی دنیا میں پاکستان کے

female journalists joining their male colleagues in grappling with shared challenges like increasing reporters' safety and maintaining the integrity of their journalism.

One member of the group, Lahore-based Express News producer Sumeera Riaz, later wrote, "The EWC is highlighting the need to professionally look into the challenges of female journalists in Pakistan so that we come up with a roadmap to enhance women's participation in Pakistan's news industry. This can help us make women an equal partner in the democratic change that is taking place in Pakistan."

In the Pakistan-U.S. Journalists Exchange program, the women were always put on equal footing with male colleagues in discussions and debates, and were asked to make presentations and speak in public forums in various cities throughout the United States. It was wonderful to see many of them find their voice and gain a stronger sense of their ability to influence change.

One such journalist was Najia Ashar, an anchor and reporter for Geo Television, who noted that the "2013 Pakistan-US Journalists Exchange was a turning point in my career." Besides covering stories in the studio as an anchor, I started writing in Jang and The News International (including pieces) about important women's issues, gender discrimination, and harassment."

Najia is currently a John S. Knight Fellow at Stanford University working on a multi-model project for reducing the dangers of journalism in Pakistan. One of her American colleagues in the exchange just profiled Najia for her news outlet's "rising stars and provocateurs" page. I doubt Najia would have imagined herself as a provocateur back in 2013.

There are other examples, too, of women from the exchange exerting their voice and leadership. Sumeera Riaz (2012) has gone on to assume a position of newsroom leadership as part of the editorial team at Express News TV, setting the agenda and making decisions on the news coverage on all range of issues from human rights, economy, to war on terror and security.

In 2014, she was one of nine journalists selected from around the world for a World Press Institute Fellowship. Imrana Saghar (2012) at Express News in Multan has won many awards for her work highlighting human rights abuses of women and children in Southern Punjab, and Aneela Khalid (2012) is defying stereotypes and cultural norms as one of few women anchoring a TV talk show in Pashto language on Khyber News in Peshawar. Henna Saeed (2011) joined the program at the start of her career. She went on to win a prestigious Chevening Scholarship in 2012 and has now returned to Pakistan to anchor and produce a daily international show on Channel 24. She wrote of the impact of the program, "I very proudly say that I owe all my success to East-West Center's Journalist Exchange program, because it gave me the confidence to pursue my dreams, work independently and understand that women are at equality to men in the practical field and sometimes they are even better."

Seeing the enthusiasm and energy of dynamic women like these, it would be difficult not to be optimistic about the future for women in media in Pakistan. "Despite the tough working conditions, threats, low salaries and pressure," Najia writes, "the fact remains that more and more women are joining media in Pakistan and moving forward with determination and persistence. I believe in future, many females will rise to top positions in media organizations." ■

نیوز رومز زیادہ متنوع اور متوازن ہوں گے کیونکہ خواتین صحافی اپنے مرد ساتھیوں کے ہمراہ رپورٹروں کی سلامتی کو یقینی بنانے اور اپنی صحافت میں دینا متاداری کو برقرار رکھنے کے چیلنجوں سے نہرڈ آزما رہی ہوں گی۔

اس گروپ کی ایک رکن انیکسپریس نیوز لاہور کی نیوز پروڈیوسر سمیرا ریاض نے لکھا کہ "ایسٹ ویسٹ سینٹر پاکستان میں خواتین صحافیوں کو درپیش چیلنجوں کو پیشہ ورانہ انداز میں اُجاگر کرنے کی ضرورت پر زور دے رہا ہے تاکہ ہم پاکستان کی نیوز انڈسٹری میں خواتین کی زیادہ سے زیادہ شرکت کا ایک خاکہ تیار کر سکیں۔ اس طرح سے پاکستان میں وقوع پزیر جمہوری تبدیلی کے عمل میں خواتین کو مساوی طور پر شرکت کرنے میں مدد ملے گی۔"

پاکستان۔ یو ایس جرنلسٹس ایکسچینج پروگراموں کے دوران میں ہونے والے بحث مباحثوں میں خواتین ہمیشہ اپنے مرد ساتھیوں کے ساتھ شانہ بشانہ رہتی ہیں اور اُن سے کہا جاتا ہے کہ وہ پریزنٹیشنز دیں اور امریکہ کے مختلف شہروں میں تقریبات سے خطاب کریں۔ انہیں اپنی آواز سننے ہونے اور تبدیلی کے عمل کو ہمیز دینے کی اپنی صلاحیت میں اضافہ کرتے ہوئے دیکھنا بہت خوشگوار ہوتا ہے۔

اسی طرح کی ایک صحافی جیو ٹیلی ویژن کی رپورٹر اور اینکر ناچیرا اشعر کا کہنا ہے کہ 2013ء کا پاکستان۔ یو ایس جرنلسٹس ایکسچینج پروگرام اُن کی پیشہ ورانہ زندگی میں ایک فیصلہ کن موڑ تھا۔ اپنے اسٹوڈیو میں ایک اینکر کے طور پر کام کرنے کے ساتھ ساتھ میں نے روزنامہ جنگ اور نیوز انٹرنیشنل میں خواتین کے مسائل، صنفی امتیاز اور برساں کرنے کے حوالے سے مضامین لکھنا شروع کر دیئے۔ اس وقت ناچیرا فورڈ یونیورسٹی میں جان ایس ٹائٹ فیلو کے طور پر پاکستان میں صحافت کو درپیش خطرات میں کمی لانے کے ایک ملٹی ماڈل پراجیکٹ پر کام کر رہی ہیں۔ اس پروگرام میں شریک اُن کی ایک امریکی ساتھی نے ناچیرا کے حوالے سے اپنے خبروں والے صفحے پر اُسے اُبھرتا ہوا ستارہ اور جوش و جذبہ دلانے والی کہہ کر مخاطب کیا۔ میرا نہیں خیال کہ 2013ء میں ناچیرا اپنے آپ کو ایسا تصور کرتی ہوگی۔

ایکسچینج کے پروگراموں میں شریک خواتین میں اپنی آواز اُٹھانے اور قیادت کرنے کی صلاحیت پیدا ہونے کی ویسگر مثالیں بھی موجود ہیں۔ سمیرا ریاض (2012) نے ایکسپریس نیوز ٹیلی ویژن کی ایڈیٹوریل ٹیم کی رکن ہونے کی حیثیت سے نیوز روم کی قیادت سنبھالی اور انسانی حقوق، معیشت، دہشت گردی کے خلاف جنگ اور امن و سلامتی سمیت تمام موضوعات کی خبروں کی کوریج کے فیصلے کرنے کو اپنے ایجنڈے کا حصہ بنایا۔ 2014ء میں ورلڈ پریس انسٹی ٹیوٹ کی فیلو شپ حاصل کرنے والے دنیا بھر کے نو صحافیوں میں سمیرا ریاض بھی شامل تھی۔ عمران سائفر (2012) ایکسپریس نیوز ملتان نے جنوبی پنجاب میں خواتین اور بچوں کے حقوق کی خلاف ورزیوں کو بے نقاب کرنے پر کئی ایوارڈز حاصل کئے۔ خیبر نیوز پشاور پر پشتو میں مباحثہ کے پروگرام کی میزبان انیلہ خالد (2012) ٹیلی ویژن پر میزبانی کرنے والی چند پشتون خواتین میں سے ایک ہیں جو روایات اور ثقافتی پابندیوں کے باوصف اپنی ذمہ داریاں بخوبی نبھاتی ہیں۔ حنا سعید (2011) نے اس پروگرام میں اپنے کیریئر کے آغاز میں شمولیت کی۔ اور 2012ء میں قابل فخر چیونگ اسکالر شپ حاصل کیا۔ اب وہ پاکستان واپس آ کر جینٹل 24 پروڈیوٹرز ایک بین الاقوامی پروڈیوٹرز کے ساتھ ساتھ اس کی میزبانی بھی کر رہی ہیں۔ انہوں نے اس پروگرام کی افادیت کے بارے میں لکھا کہ "مجھے یہ بتاتے ہوئے بہت فخر محسوس ہوا ہے کہ میں اپنی کامیابی کو ایسٹ ویسٹ سینٹر کے جرنلسٹس ایکسچینج پروگرام کی مرہون منت سمجھتی ہوں کیونکہ اس نے مجھے اپنے خواب پورے کرنے، خود اعتمادی سے کام کرنے اور یہ سمجھنے کا موقع فراہم کیا کہ خواتین عملی میدان میں مردوں کے ہم پلہ ہیں بلکہ بعض اوقات وہ اُن سے بہتر ثابت ہوتی ہیں۔"

اس طرح کی پُر اعتماد متحرک اور فعال خواتین کو دیکھتے ہوئے پاکستان کے ذرائع ابلاغ میں خواتین کے شاندار مستقبل کی پیش گوئی کرنا کچھ خاص مشکل نہیں رہتا۔ ناچیرا لکھتی ہیں کہ سخت حالات کار، خطرات، کم معاوضوں اور ہڈ بٹنے کے باوجود یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ زیادہ سے زیادہ خواتین پاکستان کے ذرائع ابلاغ میں شامل ہو رہی ہیں اور وہ ثابت قدمی اور عزم و ہمت کے ساتھ آگے بڑھتی جا رہی ہیں مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں بہت سی خواتین ذرائع ابلاغ کے اداروں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوں گی۔ ■



SPORTS JOURNALIST

FATIMA SALEEM

سپورٹس جرنلسٹ

فاطمہ سلیم

My parents were enthusiastic about sports, especially my mother. She used to tell us about playing all types of sports with the neighborhood boys when she was younger, even as the only girl among them. Then when I was growing up, she would set up a volleyball net or get us footballs to play with. Meanwhile, my father, who was obsessed with cricket, would spend hours both watching and playing cricket with us. When I was 7, I also discovered swimming and took part in swimming competitions until I was 12. With the influence from my family, my love for sports grew stronger and stronger.

I always knew that sports was my forte and I dreamed about covering international events. The camera and the microphone always excited me. When I joined GEO TV, my first assignment was to go out into the streets and interview sports fans. Since then I have never looked back, from covering the Beijing Olympics, to covering national football, cricket, and hockey games. I have also met many sports personalities, some of whom are my heroes, and that is a great feeling. I remember reporting live for Naseem Hameed, who became the fastest woman in South Asia when she won the 100-meter race at the South Asian games. I reported live from her neighborhood, where emotions were running high, as the neighbors stood and waited all morning for her to arrive. They brought their young daughters to support her as well, saying "we want our daughter to play sports and win for our country!" I was just so proud to be part of it. It was then I knew that Pakistani women could not be stopped, and with the support of our families and friends we can win more medals and make a name for ourselves. In the spirit of this belief, I want to host my own sports show one day, where I produce and write to appeal more to women.

Along the way, I have overcome many obstacles, including discrimination and paternalism. I have learned to ignore people staring at me, getting bullied on social media, and being criticized, especially about my weight or western clothes, and I am much stronger than before. I often hear, "don't go reporting, there will be too many men present at the match." Or, entire stories would be prepared for me, and I only had to only sit in front of the camera and interview a guest. Sometimes, my colleagues suggested that I try other beats like entertainment, claiming that girls can't survive the sports beat in Pakistan. Women who had written or hosted sports shows had quit or were pursuing something totally different, but I never wanted to leave sports. I knew my colleagues were looking out for me, but they didn't realize that they were killing my confidence. I am sick and tired of hearing "YOU ARE A GIRL." I know I am a girl and I am telling you I can do this! I have to keep on working hard to fight against stereotypical mindsets to prove that I can be as good as my male counterparts.

Although there were many women who made names for themselves in sports before me, there weren't any role models around when I started my career. Now, there are a few confident women who are covering sports, and doing a great job. These women, who refuse to give up and fight against all odds, have inspired so many women around the world. For example, Mayanti Langer, an unstoppable Indian sports journalist, is someone I have always looked up to. Her grace and confidence impresses me and I wish to be like her.

We overcame the mindset that women can't talk about sports, and now women are proving everyone wrong. Still, it would be nice to see more Muslim sports journalists on international channels, like ESPN. I think this would be appreciated by the world and would encourage more women. Why can't a Muslim girl who wears a head scarf report about American football on American TV? That would be amazing! ■

میرے والدین خاص طور پر میری والدہ کھیلوں میں بہت دلچسپی لیتی تھیں۔ وہ ہمیں بتاتی تھیں کہ کس طرح سے وہ بچپن میں ہمسایہ لڑکوں کے ساتھ اکیلی لڑکی ہوتے ہوئے بھی مختلف کھیلوں میں حصہ لیا کرتی تھیں۔ جب میں کچھ بڑی ہوئی تو انہوں نے والی بال کا نینٹ لگایا یا ہمیں فٹبال مہیا کیا تاکہ ہم کھیل سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے والد، جنہیں کرکٹ دیکھنے اور کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ ہمارے ساتھ گھنٹوں کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ جب میں سات برس کی ہوئی تو مجھے پیرا کی کاشوق ہوا اور میں بارہ برس کی عمر تک پیرا کی کے مقابلوں میں حصہ لیتی رہی۔ میرے خاندان کی وجہ سے کھیلوں میں میری دلچسپی ہرگز رتے دن بڑھتی گئی۔

کھیلوں میں اپنی دلچسپی کو میں ہمیشہ سے جانتی تھی۔ اور میں ایک روز کھیلوں کے عالمی مقابلوں کی کوریج کرنے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ کیرہ اور مائیکروفون دیکھ کر میرا شوق بڑھ جایا کرتا تھا۔ جب مجھے حیوانی وی میں ملازمت ملی تو میری پہلی ذمہ داری تھی کہ میں شہر کی سڑکوں اور گیٹوں میں جا کر کھیلوں کے شائقین سے انٹرویو لوں۔ وہ دن اور آج کا دن، میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ میں نے بیجنگ اولمپکس سے لے کر قومی فٹبال، کرکٹ اور ہاکی تک کے مقابلوں کی کوریج کی۔ میں کھیلوں کی کئی معروف شخصیات سے بھی ملی۔ ان میں سے کچھ لوگ میرے بہرہ و تھے اور ان کے ساتھ ملاقات کا موقع ملنا بہت خوشی کی بات تھی۔ مجھے ساتھ ساتھ ایشین گیمز میں ایک سویڈن کی دوڑ میں اول انعام حاصل کرنے والی سیم مید کی لائیو رپورٹنگ بھی اچھی تک یاد ہے۔ میں اس کے گھر کے قریب سے رپورٹنگ کر رہی تھی۔ اس وقت لوگوں میں بے حد جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ بڑی تعداد میں اس کے ہمسایے پوری صبح اس کی آمد کے منتظر رہے تھے۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی بچیوں کو بھی ساتھ لائے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری بیٹیاں بھی کھیلوں میں حصہ لیں اور اپنے ملک کے لئے اعزازات حاصل کریں۔ مجھے اس سارے منظر کا حصہ بننے پر بھی خوشی ہو رہی تھی۔ مجھے اس وقت یہ احساس ہوا کہ پاکستانی خواتین کو نہیں روکا جاسکتا۔ اور اپنے گھر والوں اور دوستوں کی مدد اور حوصلہ افزائی سے ہم زیادہ سے زیادہ اعزازات جیت سکتی ہیں اور اپنا نام روشن کر سکتی ہیں۔ اس یقین کے ساتھ میں ایک دن کھیلوں کے بارے میں اپنے پروگرام کی میزبانی کرنا چاہتی تھی جسے میں ایسے انداز میں خود کھوں اور پروڈیوس کروں جس سے خواتین کی حوصلہ افزائی ہو سکے۔

اس سفر کے دوران میں مجھے امتیازی اور میرا نسلوک سمیت کئی دشواریوں پر قابو پانا پڑا۔ میں نے گھورنے والوں، سوشل میڈیا پر دھمکانے والوں اور خاص طور پر میرے وزن اور میرے مغربی انداز کے لباس کی وجہ سے مجھ پر تنقید کرنے والوں کو نظر انداز کرنا سیکھا اور اب میں پہلے سے بہت زیادہ مضبوط اور کسو ہوں۔ مجھے اکثر کہا جاتا تھا کہ پورنگ کے لئے نہ جاؤ، وہاں بیچ میں مرد ہی ہوں گے یا میرے لئے ساری خبر یا سوالات تیار کر کے مجھے پکڑا دیئے جاتے تھے کہ میں صرف کیرے کے سامنے بیٹھ کر وہ بڑھ دوں یا کسی مہمان کا انٹرویو لوں۔ بعض اوقات میرے ساتھی کسی اور شعبے مثلاً تفریح میں اپنی صلاحیتیں آزمانے کا مشورہ دیتے تھے۔ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ لڑکیاں کھیلوں کے شعبے میں ٹھہر نہیں پائیں گی۔ جو خواتین کھیلوں کے پروگرام لکھتی یا کرتی تھیں انہیں یہ کام چھوڑ کر کسی اور طرف متوجہ ہونا پڑا لیکن میں کھیلوں کے شعبے کو چھوڑنے کے لئے رضامند نہ تھی۔ میں جانتی تھی کہ میرے ساتھی میری بہتری چاہتے تھے لیکن یہ اندازہ نہ تھا کہ ایسا کرتے ہوئے وہ میری خود اعتمادی کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ میں یہ بات سنتے سنتے عاجز آچکی تھی کہ "تم ایک لڑکی ہو، میں جانتی ہوں کہ میں ایک لڑکی ہوں اور میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ میں یہ کام کر سکتی ہوں۔ مجھے سخت محنت سے کام کرنا اور گھسی پٹی سوچ رکھنے والوں کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے یہ ثابت کرنا تھا کہ میں اپنے مرد ساتھیوں کی طرح اچھا کام کر سکتی ہوں۔ اگرچہ مجھ سے پہلے کھیلوں کے شعبے میں کام کر کے نام کمانے والی بہت سی خواتین تھیں۔ لیکن جب میں نے اس شعبے میں اپنا کیریئر شروع کیا تو ان میں کوئی بڑا نام نہ تھا۔ اب کچھ پُر اعتماد خواتین ایسی ہیں جو کھیلوں کی کوریج کے شعبے میں بہت اچھا کام کر رہی ہیں۔ تمام مشکلات کا مقابلہ کرنے اور شکست تسلیم نہ کرنے والی ان خواتین نے دنیا بھر میں بہت سی خواتین کو متاثر کیا ہے۔ مثال کے طور پر بھارت سے تعلق رکھنے والی مایا تھی لاگر ایک ایسی خاتون صحافی ہے جس کی راہ میں کوئی مشکل حائل نہیں ہو سکتی۔ میں ایسی ہی خواتین کی منتظر تھی۔ میں اس کی دلکشی اور اعتماد سے بہت متاثر ہوں اور اس جیسا بننا چاہتی ہوں۔

ہم نے اس ذہنیت کو شکست دی کہ خواتین کھیلوں کے بارے میں بات نہیں کر سکتیں۔ اب خواتین ہر کسی کو غلط ثابت کر رہی ہیں۔ کھیلوں کی کسی مسلمان صحافی کو ESPN جیسے عالمی چینل پر کام کرتے دیکھنا بہت خوشگوار ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ دنیا اس کی قدر اور دیگر خواتین کی حوصلہ افزائی کرے گی۔ سربراہ کرف باندھے ایک مسلمان لڑکی کسی امریکن ٹی وی پرامریکن فٹ بال کی کوریج کیوں نہیں کر سکتی؟ یہ بہت حیران کن منظر ہوگا۔ ■

THE FREEDOM TO SHARE THOUGHTS AND OPINIONS

INTERVIEW WITH FRANCE FRANCOIS, FREELANCE WRITER FOR ONLINE PUBLICATIONS, U.S.

خیالات و آراء کا تبادلہ کرنے کی آزادی: یولیس آن لائن پبلیکیشنز کے لئے آزاد مصنف فرانس فرانکوئی سے انٹرویو

Please describe your role in media. Include a description of how your work gets done on a daily basis.

I currently write freelance news and opinion pieces for Ebony.com, TheRoot.com, EIRAM.org, and other online publications. As a freelance writer, I have the flexibility of choosing when I write and what I write about. I send a "pitch" (3-5 sentences describing what I would like to write about and its relevance to that site) to an editor. If the pitch is picked up, I then write and submit the piece for publishing. Once I've built a good rapport with an editor, they often approach me with subjects they'd like me to write about for them based on current events and their readership.

How did you come into this role? (Life long dream? Educational background? Career switch?)

Writing has always been something I have enjoyed. When I lived in Cairo, Egypt in 2010, I started a blog called Black in Cairo primarily as a way to update my friends and family. It became so popular that it won the Best Travel Blog award. For years, people emailed and tweeted me questions and comments, even after I moved back to the U.S., and I even ran into fans on occasion! That was the first time that I realized how wide of a reach my words could have. Thus, when I quit my job in 2013, I decided to pursue writing more seriously while I pursued another career.



ازراہ کرم ذرائع ابلاغ میں اپنے کردار پر روشنی ڈالنے اور بتانے کے آپ روزمرہ کا کام کیسے نمٹاتی ہیں؟

میں اس وقت Ebony.com, TheRoot.com, EIRAM.org اور دیگر آن لائن اشاعت کرنے والے اداروں کے لئے آزادانہ طور پر خبریں اور اپنی رائے لکھتی ہوں۔ آزادانہ طور پر کام کرتے ہوئے مجھے اپنی پسند کے موضوعات اور اپنی مرضی کے وقت پر لکھنے کی سہولت حاصل ہے۔ میں ایک خاکہ ایڈیٹر کو بھیجتی ہوں (جو عام طور پر موضوع اور اس مخصوص سائٹ کے ساتھ اس موضوع کی وابستگی کو دو تین سطروں میں بیان کرتا ہے)۔ اگر یہ خاکہ منظور کر لیا جاتا ہے تو پھر میں اس پر اپنی تحریر لکھ کر شائع کرنے کے لئے بھیج دیتی ہوں۔ جب کسی ایڈیٹر

کے ساتھ میرا تعلق بہتر ہو جاتا ہے تو پھر مجھے اکثر وہ اپنی ضرورت کے ایسے موضوعات پر لکھنے کا کہتے ہیں۔ جو حالات حاضرہ اور اُن کے قارئین کے ساتھ لگا کھاتے ہوں۔

آپ نے یہ کام کیسے اپنایا؟ (کیا یہ آپ کی دلی خواہش تھی، آپ کا تعلیمی پس منظر اسی کا تھا، یا آپ نے اپنا پیشہ خود تبدیل کیا؟)

مجھے ہمیشہ سے لکھنے میں مسرت محسوس ہوتی ہے۔ جب میں مصر کے دارالحکومت قاہرہ میں 2010ء میں رہ رہی تھی تو میں نے ایک بلاگ "بلیک ان کازرو" کے نام سے لکھنا شروع کیا تھا اس کا بنیادی مقصد اپنے گھر والوں اور دوستوں کو صورت حال سے آگاہ رکھنا تھا۔ یہ بلاگ اس قدر مقبول ہوا کہ اسے Best Travel Blog کا اعزاز ملا۔ اگرچہ اب مجھے امریکہ منتقل ہونے کی برس گزر چکے ہیں لیکن اب بھی مجھے شائقین کی طرف سے ای میلز اور ٹویٹس کی صورت میں اُن کے سوالات اور آراء موصول ہوتی ہیں اور کبھی کبھار راہ چلنے شائقین سے میرا آسنا سامنا ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میری تحریر کس قدر وسیع حلقے تک پہنچ سکتی ہے۔ اسی لئے جب 2013ء میں، میں نے اپنی ملازمت چھوڑی تو میں نے کسی اور پیشہ کا رخ کرنے کے بجائے لکھنے کو زیادہ ترجیح دی۔ میرا ارادہ ہے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ میں صرف اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کی مسرت کے لئے لکھوں گی۔

یہ بتائیے کہ آپ کا کام دوسروں کو کیسے متاثر کرتا ہے؟

ایک بار ایسا ہوا کہ ایک دوست کے گھر میں میرا تعارف ویسٹ ورجینیا کی رہنے والی ایک نوجوان لڑکی سے کرایا گیا۔ جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ میرا نسلی تعلق بیٹی سے ہے تو اُس نے مجھ سے ڈومینیکن عدالت کے ایک حالیہ فیصلے کے بارے میں، جس میں بیٹی سے نسلی تعلق رکھنے والے ڈومینیکن شہریوں کی شہریت ختم کر دی گئی تھی، گفتگو شروع

I intend to one day spend my days writing for the sheer joy of creative expression.

Describe how you feel your work impacts others.

I was once introduced to a young lady from West Virginia at a friend's house. When she realized that I was of Haitian descent, she immediately engaged me in a conversation about a recent Dominican court ruling stripping citizenship from Dominicans of Haitian descent. She told me she learned about the issue when she happened across an article on Ebony online. I immediately realized that she was referring to the article that I had written!

When I told her who I was, she was both surprised and ecstatic to share her thoughts with me.

Often times, the voices and experiences of certain segments of society can be marginalized by the mainstream media. Similar to my run-in with the West Virginian, my impact has been to bring real people into the storytelling process and bring those stories to more diverse communities.

What do you feel is your greatest accomplishment working in media so far?

The media industry is a tough industry to break into, especially for someone like myself who did not go to a top-tier journalism school. That being said, I believe my greatest accomplishment thus far is getting my foot in the door and being sought after to stay. As my reach grows and more people read my work, I am now being approached by other media outlets to work with them as an expert on certain issues.

How does what you do shape the American narrative and/or shape American culture?

One of the greatest things about America is its diversity of thought and opinion, and the freedom to share those thoughts and opinions. There have been times where I have been nervous about writing an opposing opinion because public opinion was seemingly already shaped by other pundits, editorialists, or even aggressive Tweeters. However, I've expressed opposing views only to later be thanked and supported by people who felt that they couldn't do so themselves. Thus, I shape the American narrative by continuing to show that there is no single American narrative. We can and should disagree respectfully. Public opinion, like people themselves, can change

کر دی۔ اُس نے بتایا کہ اُسے اس مسئلے کے بارے میں Ebony بر آن لائن ایک مضمون پڑھ کر غم ہوا۔ میں نے فوراً یہ جان لیا کہ وہ میرے ہی لکھے ہوئے ایک مضمون کا حوالہ دے رہی ہے۔ جب میں نے اُسے بتایا تو اسے حیرت بھی ہوئی اور وہ اپنے خیالات کے بارے میں مجھے آگاہ کرتے ہوئے بہت خوش ہوئی۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ذرائع ابلاغ میں بعض حلقوں کی آواز اور صورت حال نظر انداز کر دی جاتی ہے۔ جس طرح سے ویسٹ ورجینیا والی لڑکی نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا تھا۔ اسی طرح سے میری کوشش ہوتی ہے کہ لوگوں پر بیتے والی کہانیاں اُن کی اپنی زبانی سنوں اور انہیں متنوع لوگوں تک پہنچاؤں۔

میڈیا میں کام کرتے ہوئے آپ اب تک کس کام کو اپنی سب سے بڑی کامیابی سمجھتی ہیں؟

ذرائع ابلاغ کا شعبہ ایک مشکل شعبہ ہے۔ خاص طور پر میرے جیسے لوگوں کے لئے جنہیں صحافت کی تعلیم کسی بڑی یونیورسٹی میں حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس حقیقت کے باوجود یہ میری سب سے بڑی کامیابی ہے کہ میں اس شعبے میں قدم رکھ چکی ہوں اور مجھ سے یہاں رہنے کو کہا جا رہا ہے۔ چونکہ میری پہنچ بڑھ رہی ہے اور میری تحریریں پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس لئے اب دیگر ذرائع ابلاغ بھی مجھ سے رابطہ کر کے مختلف موضوعات پر ایک ماہر کی حیثیت سے میری خدمات حاصل کرنا چاہ رہے ہیں۔

آپ امریکی ثقافت اور یا امریکی داستان گوئی کے اسلوب اور خدو خال کو کیسے ترتیب دینا چاہیں گی؟

امریکہ کی سب سے بڑی خوبی خیالات اور آراء کا تنوع اور ان کا اظہار کرنے کی آزادی ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ میں بعض ایسے موضوعات پر اپنی مخالفت رائے لکھنے کے حوالے سے متذبذب تھی۔ جن پر ماہرین، ادارہ نویسوں یا جارحانہ ٹوئٹس نے اپنے طور پر رائے عامہ کے مزاج کا تعین کر دیا تھا۔ تاہم جب میں نے رائے عامہ کے خلاف لکھا تو مجھے اُن لوگوں کی طرف سے شکر یہ اور حمایت کے پیغامات موصول ہوئے جو اپنے طور پر مخالفت کا اظہار نہیں کر پا رہے تھے۔ اس لئے میں امریکی بیانیہ کو ایسے انداز میں ترتیب دے رہی ہوں کہ یہاں کوئی اکلوتا امریکی بیانیہ وجود نہیں رکھتا۔ ہم ایک دوسرے کا احترام کرتے ہوئے اختلاف رائے رکھ سکتے ہیں اور رکھتے ہیں۔ لوگوں کی طرح رائے عامہ بھی مزید معلومات حاصل ہونے اور مختلف آراء کے منظر عام پر آنے سے تبدیل ہوتی ہے۔

and grow as more information is presented and contact with different viewpoints become more common.

What are the general challenges of working in the media environment today?

One of the strengths and challenges of today's media environment is that it is a 24-hour, interconnected environment in which every and anybody has a platform to share their opinion. Thus, one must be able to find sources of information that remain accurate and dedicated to integrity, while still challenging your worldview.

Do you believe that being a woman affects your work? Why or why not?

The challenge of being a woman is that other people immediately try to set limits for how far you can go and when you can do it. I learned a long time ago not to be constrained by the small-mindedness of other people. Thus, I go as far as I want to go, when I want to go, and intend to continue to do so.

What is your advice to other young women eager to play a role in media?

I would advise other young women to invest more time and energy in pursuing roles in the media. Generally, this is a field that has declined since the financial crisis. However, the "death" of traditional media only leaves more opportunities for young women to apply their creativity into new media like Youtube, Twitter, blogging, etc. By investing in branding themselves in nontraditional media, many young women have built small empires that continue to inspire others. ■

آج کل کے ماحول میں ذرائع ابلاغ میں کام کرنے میں کون سے عام چیلنج درپیش ہوتے ہیں؟

آج کل کے ذرائع ابلاغ کے ماحول کی سب سے بڑی طاقت اور چیلنج یہ ہے کہ یہ چوبیس گھنٹے باہم مربوط ہے جس میں ہر کسی کو ہر وقت اپنی رائے کے اظہار کے لئے کوئی نہ کوئی پلیٹ فارم دستیاب رہتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہر کوئی صحیح اور دیانت دارانہ معلومات فراہم کرنے والے ذرائع تلاش کر سکے۔ جو دنیا کے بارے میں آپ کی رائے کو چیلنج کر سکیں۔

کیا آپ کے خیال میں خاتون ہونے کے ناطے آپ کا کام متاثر ہوتا ہے؟ اگر نہیں ہوتا تو کیوں اور اگر ہوتا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟

خاتون ہونے کا سب سے بڑا چیلنج یہ ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ فوری طور پر آپ کی رسائی اور پکھ کر گزرنے کی صلاحیت کی حدیں متعین کرنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ میں نے یہ بات بہت پہلے سمجھ لی تھی کہ دوسرے لوگوں کی محدود ذہنیت کو اپنی راہ میں حائل ہونے نہیں دینا ہے۔ اس لئے میں جب اور جہاں تک جانا چاہتی ہوں چلی جاتی ہوں اور میں ایسا کرتی رہوں گی۔

ذرائع ابلاغ میں کام کرنے کی خواہش مند دیگر لڑکیوں کو آپ کیا مشورہ دینا چاہیں گی؟

میں نوجوان صحافی خواتین سے یہ کہنا چاہوں گی کہ وہ اس شعبے میں اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے اپنی بھرپور صلاحیتوں اور وقت کا استعمال کریں۔ عام طور پر تو اس شعبے میں بھی معاشی بحران کی وجہ سے زوال آیا ہے۔ تاہم روایتی ذرائع ابلاغ کی "موت" نے نوجوان خواتین کو اپنی تخلیقی صلاحیتیں دیگر نئے ذرائع مثلاً یوٹیوب، ٹویٹر، بلاگنگ وغیرہ میں استعمال کرنے کے مواقع عطا کئے ہیں۔ غیر روایتی ذرائع ابلاغ کے ساتھ وقت صرف کرتے ہوئے کئی نوجوان خواتین نے اپنی الگ دنیا تخلیق کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اور یہ بات دوسروں کے لئے ہمیز کا کام دے رہی ہے۔ ■



MEDIA SNAPSHOT:

ALUMNAE IN MEDIA

پاکستانی ذرائع ابلاغ میں امریکی تبادلہ پروگراموں کی سابقہ طالبات

The profiles below are of Pakistani women in media who have participated in U.S. State Department professional exchange programs. As program alumnae, they share their insights on work in Pakistan and their experiences in the U.S. The first two alumnae, Maryam Usman and Rubab Hussain, were guests on the U.S. Embassy program “Tea Time,” and were participants of the US-Pakistan Professional Partnership Program. Here’s what they had to say....

ذیل میں ذرائع ابلاغ میں کام کرنے والی اُن پاکستانی خواتین کا تذکرہ شامل کیا جا رہا ہے جنہوں نے امریکی محکمہ خارجہ کے پیشہ ورانہ تبادلوں کے پروگراموں میں شرکت کی ہے۔ متعلقہ پروگرام کی سابق طالبات ہونے کے ناطے انہوں نے پاکستان میں اپنے کام اور امریکہ میں اپنے تجربات سے آگاہ کیا ہے۔ پہلی دو سابق طالبات مریم عثمان اور رباب حسین امریکی سفارتخانے کے پروگرام ”ٹی ٹائم“ کی مہمان اور پاک۔ امریکی پیشہ ورانہ اشتراک پروگرام میں شریک تھیں۔ دیکھئے وہ کیا کہتی ہیں:

MARYAM USMAN

Reporter with Express Tribune

Journalism is a form of public service. You are the eyes and ears on the ground, and to give unbiased coverage is one of the best things you can do. I have been a reporter with Express Tribune Newspaper for the last 4 years, first with the desk and now with the editorial section on the arts and culture beat. Being in the newspaper is wonderful and if you enjoy what you do, then it is gratifying. In fact, the instant gratification from people following what you write is what print journalists live for. However, it does come with a set of challenges. For example, you have to put on a brave front and create your own space sometimes, because no one will give it to you. Also, journalism is a 24-hour profession. When I was a student, I thought it was cool that journalists had meetings in the wee hours, but the unstructured timing is a real challenge. Lastly, although the trend has changed for the better, we still need more women in leadership roles. For example 30 years ago, Quatrina Hussain was the only female journalist around and she was the one to encourage us. Even today, I think Express Tribune encourages women in the workplace, so we are seeing progress.

ON HER U.S. EXPERIENCE...

I am a foodie, so I was placed with San Antonio Express News in Texas, on the food desk. I worked with food reporters in the culinary field, who took writing about food seriously. It was similar to my beat here, because I was still experiencing culture, this time American, which was a different representation than what you see or hear in the movies. While there I tried Tex-Mex (a fusion cuisine of American and Mexican cuisine), brisket, steaks, burgers, and interestingly enough, a new Pakistani restaurant that opened – Kohinoor-- and I was told that I'd be the expert on evaluating it as a Pakistani!

I worked on a couple of stories, including one about the resurgence of soda fountains which is a quintessential American delight that suffered a downfall after the recession. While working there, one thing I noticed was that news in San Antonio has a localized context. They are big on prioritizing what's important in their communities, with their people. I was also impressed with how reporters went out in the field and made videos to incorporate into their stories, giving a more holistic view of the story being discussed. Lastly, I saw that in newsrooms, there isn't a strong sense of hierarchy, and colleagues practice an open-door policy. Even the editors roam around the newsroom and are open to communicating, which makes the work culture friendlier.

Even though the work atmosphere was relaxed, it was still very organized and focused, no undue delays.

Regarding the cultural exchange I experienced as a Pakistani, I realized that I was as new to Americans, as they were to me, so I came across all sorts of questions. Also, while San Antonio is very socially diverse, there are a lot of misconceptions and media biases on Pakistan, as Pakistan makes the headlines for all the wrong reasons. Overall, my six weeks in San Antonio were amazing and I consider it the experience of a lifetime.

RUBAB HUSSAIN

Supreme Court Reporter with Samaa TV

As journalists, we serve the nation by informing the public and highlighting things that are hidden from them. I'm not a "9-5" kind of person and I want to have opportunities to speak to people, so I really enjoy my job.

مریم عثمان - رپورٹر ایکسپریس ٹریبون

صحافت عوامی خدمت کا ایک طریقہ ہے۔ آپ عملی زندگی میں لوگوں کی آنکھوں اور کانوں کا کام کرتے ہیں اور غیر جانبدارانہ کوریج کر کے آپ سب سے بڑی خدمت کرتے ہیں۔ میں گذشتہ چار برس سے ایکسپریس ٹریبون کے ساتھ وابستہ ہوں۔ پہلے میں ڈیک پہ کام کرتی تھی اور اب ادارتی شعبے میں فنون اور ثقافت سے متعلق معاملات دیکھتی ہوں۔ اخبار میں کام کرنا بہت زبردست تجربہ ہے اور جب آپ اپنے کام سے لطف اندوز ہو رہے ہوں تو پھر بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ درحقیقت آپ کو اپنی تحریر پر عوام کی طرف سے جو فوری رد عمل ملتا ہے۔ اخبارات میں کام کرنے والوں کے لئے اسی کا اطمینان کافی ہوتا ہے۔ تاہم اس سب کچھ کے ساتھ بہت سے چیلنج بھی وابستہ ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کو بعض اوقات اپنی جگہ خود بنانا پڑتی ہے کیونکہ کوئی بھی آپ کو جگہ دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ صحافت چوبیس گھنٹے کا کام ہے۔ جب میں طالبہ تھی تو میرا یہ خیال تھا کہ صحافی رات گئے تک یا علی الصبح جو ملاقاتیں کرتے ہیں وہ کوئی بڑی بات نہیں۔ لیکن کام کا کوئی متعین وقت مقرر نہ ہونا ہی سب سے بڑا چیلنج ہے۔ آخری بات یہ کہ اگرچہ اب رجحان بہتر ہو چلا ہے لیکن اب بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ زیادہ خواتین کلیدی اسامیوں پر تعینات ہوں۔ مثال کے طور پر تیس برس پہلے صرف قریباً 50 خواتین صحافی تھیں اور وہ اکیلی ہماری حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ آج بھی ایکسپریس ٹریبون اپنے ہاں کام کرنے والی خواتین کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اسی لئے ہمیں ترقی نظر آ رہی ہے۔

امریکہ کے حوالے سے اپنے تجربہ کے بارے میں وہ کہتی ہیں:

چونکہ مجھے کھانے پینے سے دلچسپی ہے اس لئے مجھے ٹیکساس میں سان انٹونیو ایکسپریس نیوز کے فوڈ ڈیک کے ساتھ منسلک کیا گیا۔ میں نے کھانے پکانے کے شعبے میں کام کرنے والے رپورٹروں کے ساتھ کام کیا جو خوراک کے بارے میں لکھنے لکھانے کی ذمہ داری کو بہت سنجیدگی سے نبھاتے تھے۔ یہ میری یہاں کی ذمہ داریوں سے ملتا جلتا کام تھا۔ کیونکہ اب میں امریکی ثقافت سے روشناس ہو رہی تھی اور یہ سب فلموں میں دکھائی جانے والی ثقافت سے مختلف تھا۔ میں وہاں ٹیکس میکس (امریکی اور میکسیکن کھانوں کا ایک شاندار امتزاج) بریکسٹ، سٹیکس اور برگرز جیسے کھانوں سے لطف اندوز ہوئی اور دلچسپ بات یہ کہ جب وہاں ایک نیا پاکستانی ریستورنٹ "کوہ نور" کے نام سے کھلا تو مجھے ایک پاکستانی ماہر ہونے کی حیثیت سے اس کے کھانوں کا تجربہ کرنے کی ذمہ داری بھی دی گئی۔

میں نے چند خبروں پر کام بھی کیا۔ ان میں سے ایک سوڈا فونٹین کے احیاء کے بارے میں تھی جو امریکہ کا ایک مقبول مشروب تھا اور کساد بازاری کی وجہ سے اس کی فروخت میں کمی آگئی تھی۔ میں نے وہاں کام کرتے ہوئے ایک بات محسوس کی کہ سان انٹونیو میں خبروں کو مقامی تناظر میں دیکھا جاتا ہے۔ جو خبریں مقامی آبادیوں اور ان میں رہنے والے لوگوں کے لئے اہمیت رکھتی ہیں انہی خبروں کو اجاگر کیا جاتا تھا۔ مجھے اس بات نے بھی بہت متاثر کیا کہ کس طرح سے رپورٹر باہر جا کر اپنی خبروں کو مزید جامع بنانے کے لئے وڈیو ریکارڈنگ کرتے اور انہیں اپنی خبروں کا حصہ بناتے تھے۔ پھر یہ کہ میں نے دیکھا کہ وہاں نیوز روم میں مراتب کا کچھ زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ تمام سچی آزادانہ طور پر کام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ایڈیٹر بھی نیوز روم میں آتے جاتے تھے اور ان کے ساتھ بات چیت کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی اور یوں کام کا ماحول دوستانہ نوعیت کا تھا لیکن کام بہت منظم اور سوچے سمجھے انداز میں کیا جاتا تھا اور پاکستان کی طرح سے غیر ضروری تاخیر کا رواج نہ تھا۔

رباب حسین - سپریم کورٹ رپورٹر برائے سما ٹی وی

صحافی ہونے کے ناطے خبریں دے کر اور چھپانے جانے والے معاملات کو اجاگر کر کے ہم قوم کی خدمت کرتے ہیں۔ میں "نوسے پانچ بجے" تک کام کرنے والوں کی طرح نہیں ہوں اور میں لوگوں سے بات کرنے کے مواقع کی تلاش میں ہوتی ہوں اس لئے میں اپنے کام سے لطف اندوز ہوتی ہوں۔



صحافت بہت تبدیل ہو چکی ہے۔ جب میں نے اس شعبے میں کام شروع کیا تو ذرائع ابلاغ کے ہر گروپ میں دو یا تین خواتین صحافی ہوتی تھیں۔ لیکن اب بہت سی خواتین سکرین پر آ کر اس شعبے میں اپنی صلاحیتیں منواری ہیں۔ کچھ شعبوں کی کوریج صرف خواتین کرتی ہیں مثلاً فیشن اور فلموں پر تبصرے، سیاحت وغیرہ، کیونکہ عام خیال یہ ہے کہ خوبصورت چہرے زیادہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔ ہمیں زیادہ سنجیدہ شعبوں کا بھی رخ کرنا چاہیے تاکہ خبروں کی افادیت میں اضافہ ہو سکے۔

میں ایک بہت اچھے ادارے میں کام کرتی ہوں جہاں ہر کسی کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ مجھے کبھی بھی ہراساں نہیں کیا گیا۔ بہر حال یہ خیال اپنی جگہ موجود ہے کہ اس شعبے میں آپ کو ایک مرد کے طور پر کام کرنا ہوگا۔ چونکہ میں اپنا کام بہت محنت سے کرتی ہوں اور ادارہ میں آنے والی تمام مشکلات کا بخوبی سامنا کرتی ہوں اس لئے لوگ مجھے 'مرد' سمجھتے اور کہتے ہیں کہ مجھ میں عورتوں والی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمیں اس رویہ کو تبدیل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن یہ ایک تاثر ہے اور ہمیں اس کے ساتھ رہنا ہے۔ ایک اچھے صحافی کے طور پر اس شعبے میں رہنے اور کام کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ اوقات کار کے حوالے سے لگدار رویہ رکھتے ہوں اور اپنے کام میں گہری دلچسپی لیتے ہوں اور آپ کے اہل خانہ تعاون کرنے والے ہوں۔

امریکہ کے حوالے سے اپنے تجربہ کے بارے میں وہ کہتی ہیں:

میں کسی حد تک مینی سونا سے واقف تھی لیکن میں نے ڈولتھ شہر جانے سے پہلے اس کے بارے میں کبھی نہیں سنا تھا۔ چھپا سی ہزار آبادی کے اس چھوٹے شہر میں بہت سردی اور برفباری ہوتی ہے۔ میں وہاں مارچ کے مہینے میں بہار کی امید میں گئی تھی لیکن وہاں اُس وقت بھی سردی تھی۔ مجھے بہت سے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا اور بڑے شہروں سے دور امریکیوں سے ملنا بہت خوشگوار تھا کیونکہ اُن کے پاس آپ کے لئے وقت ہوتا ہے۔ وہ آپ کو رات کے کھانے پر بلاتے ہیں اور یہ سب کچھ پاکستان سے مختلف نہیں ہوتا۔ میں نے وہاں سکی انک، آئس اسکیٹنگ، شکار، چنار کے درختوں سے اُن کا رس نکالنے اور یہاں تک کہ غاروں میں پیرا کی کرنے جیسی کئی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ جب مجھے ویسکونسن میں اپوسٹل جزیرے پر نیشنل پارک کے ریجنرز سے انٹرویو لینے کے لئے بھیجا گیا تھا۔

ڈولتھ میں سب سے زیادہ دلچسپی قومی یا بین الاقوامی خبروں میں نہیں بلکہ مقامی خبروں میں لی جاتی تھی۔ چونکہ میں اسلام آباد میں رہتی اور پیریٹھ کوٹ میں زیر بحث سیاسی مقدمات کی کوریج کرتی ہوں اس لئے کسی علاقے میں خوراک اور ثقافت جیسی عام خبروں پر کام کرنا میرے لئے بہت دلچسپی کا باعث تھا۔ میرے ساتھی بہت اچھے تھے اور انہوں نے مجھے ایسی ذمہ داریوں میں شامل کیا جن کی بدولت مجھے وہاں کی ثقافت کو سمجھنے کا موقع مل سکے۔ مثلاً جب ائیر پورٹ پر ایک نیا جیٹ طیارہ متعارف کرایا گیا تو مجھے انجینئرز اور اس کپنی کے سربراہ سے بھی ملاقات کرائی گئی۔ یہاں ہم شہر میں توجہ دیتے ہیں لیکن وہاں لوگ ایسی خبروں کو زیادہ توجہ دیتے ہیں جن میں انسانی دلچسپی کا مواد ہو اور جو پریشان کن اور مایوسی پھیلانے والی نہ ہوں۔

جہاں تک امریکہ میں نیوز روم کلچر کا تعلق ہے تو پاکستان کے برعکس دن کا آغاز میٹنگ سے ہوتا ہے۔ یہاں تو میٹنگ کا مخصوص وقت ہی نہیں ہوتا۔ وہاں انکریز کا اپنا صحافیانہ انداز نگہ ہوتا ہے اور وہ جن معاملات پر بات کرتے ہیں اُن کے بارے میں پورا پس منظر اور تمام پہلوؤں کو شامل کرتے ہیں۔ وہاں روایط کا طور پر یقہ بھی بہت مختلف ہے۔ امریکہ میں کام کرنے والے صحافی اور اُن کے پاس ایک دوسرے کے ساتھ برابری کی سطح پر عزت و احترام سے بات کرتے ہیں۔

جب مجھے عام امریکیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا تو مجھے پاکستان کے بارے میں بتانا پڑتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے لوگوں کے ساتھ مختلف طور پر ملنا پڑے گا لیکن چونکہ ہم سب نے سردیوں کا ایک جیسا لباس پہن رکھا ہوتا تھا اس لئے میں انہی کی طرح لگتی تھی۔ صرف اُس وقت لوگوں کو پتہ چلتا تھا کہ میں کہیں اور سے آئی ہوئی ہوں جب میں بات کرتی تھی۔ اس

Journalism has changed a lot. There were only one or two female journalists in each media group when I started, but now more women are now being inspired to come on screen and more women are making a difference in the field. There are a few things that are exclusively covered by women – for example fashion, movie reviews, tourism – because of the perception that pretty faces attract more people. We need to go into hardcore issues as well, and provide more substance and value to the news.

I work in a very good organization, with good support for personnel, so I have never dealt with harassment. Nevertheless, there is still an assumption that in this career you have to be like a man. Because I work hard and take all the tasks that come my way, people call me a man and say there is nothing female about me. We try to change it, but this is the perception and we have to live with it. In order to become a good journalist and work in the field, you must be flexible with your time and passionate about your work. You have to have a supportive family.

ON HER U.S. EXPERIENCE...

I was somewhat familiar with Minnesota, but had never heard of the city of Duluth before going. It is a small city with only 86,000 people with lots of snow and ice. I went in March expecting spring, but it was still winter. I got to meet so many people and it was nice to talk to Americans outside of the metropolitan cities, because they actually have time for you. They invite you to dinner in their homes and in that sense it's not that different from here in Pakistan. I did so many local activities like skiing, ice skating, hunting, extracting maple syrup, and even cave diving at Apostle Island in Wisconsin, where I went on assignment to interview national park rangers.

In Duluth, the most interesting news was not national or international, it was local. Because I live in Islamabad and cover the Supreme Court and what goes on politically, it was interesting to do smaller stories on the region, the food, and the culture. My colleagues were very welcoming and included me on assignments to help me learn about the culture. For example, when a new jet was launched at the airport, I met with engineers, and the CEO of the company. Here, we focus on headlines, but there, they enjoy the news and focus on more human interest stories that are not stressful, or depressing.

As far as the newsroom culture in the US, the day starts with a meeting-- unlike in Pakistan where there isn't a specific time to meet. Anchors there also have a journalistic point-of-view, and are able to add value and background to the stories they report.

Communication is also very different. In the US, a journalist and his/her boss maintain the same level of respect for each other. When I came across local Americans, I actually had to tell them about Pakistan. I thought I would deal with people treating me differently, but because we were all dressed for the winter, it wasn't obvious that I was different. The only time people knew I was from somewhere else, was when I spoke, and even then they were helpful. I never came across anyone who asked me weird questions, except for one instance where we went on assignment to see law enforcement train with horses. Someone asked me if we have horses in Pakistan and I just laughed and told them yes!

RAMMA SHAHID

Producer fo ATV

Women in Pakistani media haven't always had it easy, but with the right disposition, anything is possible. My family and I were very hesitant about my choice of career because of the unpredictable nature of the media in Pakistan. Bearing that in mind, I still marched on and worked my way through electronic media. I have worked in various capacities and in each one of them I have been convinced by the fact that the media is an excellent forum for self-expression. I have since then tried my best to stay visible and uphold journalistic values in terms of my work.

While cultural taboos and self-imposed restrictions often stand in our way, the only way to come out on top is to take in criticism constructively, and to never be discouraged. I have mostly prepared television shows and I'm proud to say that I have tried to spread awareness and enlighten my audience. I try to give women a voice and explore themes that are close to their heart.

During my journey as a journalist in 2013, I was chosen to represent Pakistan in America for the International Visitor Leadership Program (IVLP) under the Edward Murrow Program for journalists. Edward Murrow's story is both of courage and conviction, two of the golden rules of journalism and I'm one of many who are inspired by his work.

ON HER U.S. EXPERIENCE...

I was humbled, honored, and extremely excited at the prospect of meeting media persons from all over the world who were also participants of the program. My group was a blend of journalists and TV personalities from South and Central Asia, and all of us were thrilled to explore America and meet with our American counterparts. Once in the United States, we were whisked off to convene with other rising media professionals, where we exchanged stories and talked about our experiences. I met with some amazing individuals and learned a great deal about America. I was pleasantly surprised at how open minded people in the United States generally are. They welcomed our arguments and held productive debates. I learned that America is a great democracy and that individuals are empowered. It was remarkable to learn that each state was independent, yet chose to be aligned within a federation.

We visited media networks, universities, NGOs, and museums and were invited to have dinner with American families. I would certainly like to offer the same hospitality that I was offered given the chance. I will fondly remember my time at Syracuse where we weren't just showed wonderful generosity but also became students once again attending classes with university students. America sure is the land of opportunity and I am glad I was given a chance to represent my country. I did my bit to clear many misconceptions about Pakistan and showed people from all over the world that women from Pakistan are strong, resilient and empowered! ■

کے باوجود لوگ بہت لمسنا تھے۔ ایک بار کے سوا مجھ سے کبھی چھیٹے ہوئے سوالات نہیں کئے گئے۔ صرف ایک بار ایسا ہوا کہ مجھے گھڑسواری کی تربیت حاصل کرنے والے پولیس اہلکاروں سے ملنے کے لئے لے جایا گیا تو وہاں ایک شخص نے پوچھا کہ کیا پاکستان میں گھوڑے ہوتے ہیں۔ تو میں ہنس پڑی اور کہا کہ ہاں ہوتے ہیں۔

رمشاہد

پاکستانی ذرائع ابلاغ میں خواتین کو کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن اچھی صلاحیتیں رکھنے والوں کے لئے سب کچھ ممکن ہے۔ پاکستان میں ذرائع ابلاغ کی غیر یقینی صورت حال کی وجہ سے میں اور میرے اہل خانہ اس شعبے کے انتخاب کے وقت خاصے متنبذ ہوتے تھے۔ یہ ساری باتیں ذہن میں ہونے کے باوجود میں الیکٹرانک میڈیا میں اپنا کام کر رہی ہوں اور آگے بڑھ رہی ہوں۔ میں نے بہت سی ذمہ داریوں پر کام کیا ہے اور ہر جگہ میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لئے ذرائع ابلاغ بہت بہتر انتخاب ہیں۔ میں اپنا کام کرتے ہوئے صحافتی اقدار کو بہترین انداز میں نبھانے اور نظر آنے کی کوشش کرتی ہوں۔

اگرچہ ثقافتی بندشیں اور خود اختیاری پابندیاں بعض اوقات راہ میں حائل ہوتی ہیں لیکن آگے بڑھنے کی ایک ہی راہ یہ ہے کہ تنقید کو تعمیری انداز میں لیا جائے اور کبھی بھی نا اُمید نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے زیادہ تر ٹیلی ویژن کے پروگرام ترتیب دئے ہیں اور مجھے فخر ہے کہ میں نے اپنے ناظرین کو آگاہ کرنے اور ان کا شعور بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے خواتین کو بولنے کا موقع دیا ہے اور کوشش کی ہے کہ ایسے موضوعات چھیڑوں جن میں ان کی دلچسپی ہو۔ 2013ء میں ایک صحافی کی حیثیت سے امریکہ میں پاکستان کی نمائندگی کرنے کے لئے میں نے صحافیوں کے لئے ایڈورڈ مروو پروگرام کے تحت انٹرنیشنل ورنیٹیڈ ریشپ پروگرام کا انتخاب کیا۔ ایڈورڈ مروو کی کہانی صحافت کے دوسرے اصولوں جرات اور پختہ عزم سے عبارت ہے اور میں بھی ان کی خدمات سے متاثر ہونے والوں میں سے ایک ہوں۔

امریکہ کے حوالے سے اپنے تجربہ کے بارے میں وہ کہتی ہیں:

میں دنیا بھر سے اس پروگرام میں شرکت کے لئے آنے والے صحافیوں سے ملنے کا موقع فراہم ہونے پر بہت زیادہ خوش تھی اور یہ میرے لئے بہت اعزاز کی بات تھی۔ میرے گروپ میں جنوبی اور وسطی ایشیاء سے تعلق رکھنے والے صحافی اور ٹیلی ویژن پر کام کرنے والے شامل تھے۔ انہیں بھی اپنے امریکی ہم منصب ساتھیوں سے ملنے اور امریکہ کو دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ امریکہ میں ہم اکٹھے ہو کر ذرائع ابلاغ میں کام کرنے والے نمایاں صحافیوں سے ملے اور مختلف خبروں پر تبصرے کرتے اور اپنے تجربات سے ایک دوسرے کو آگاہ کرتے تھے۔ مجھے بہت سے دلچسپ لوگوں سے ملنے اور امریکہ کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع ملا۔ مجھے یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ امریکہ میں عام لوگ کس قدر کھلے ذہن کے مالک ہیں۔ وہ ہماری آراء خوش دلی سے سنتے اور مفید بحث مباحثہ کرتے تھے۔ مجھے یہ احساس ہوا کہ امریکہ ایک شاندار جمہوریت ہے اور یہاں کے لوگ باختیار ہیں۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ یہاں ہر ریاست آزاد ہے اس کے باوجود وہ بخوشی وفاق کا حصہ ہے۔

ہم نے ذرائع ابلاغ کے نیٹ ورکس، یونیورسٹیوں، غیر سرکاری اداروں، عجائب گھروں کی سیر کی اور ہمیں امریکی لوگوں نے اپنے گھروں میں کھانے پر مدعو کیا۔ اگر مجھے موقع ملا تو میں بھی اسی طرح کی مہمان نوازی کروں گی۔ Syracuse میں گزارا ہوا وقت ہمیشہ میری خوشگوار یادوں میں بسا رہے گا۔ جہاں نہ صرف ہمارے ساتھ انتہائی فیاضانہ سلوک کیا گیا بلکہ ہمیں یونیورسٹی کے طلبہ کے ہمراہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع دے کر ایک بار پھر طالب علمی کے دور کے لطف سے روشناس کرایا گیا۔ یقیناً امریکہ مواقع کی سرزمین ہے اور مجھے فخر ہے کہ میں نے وہاں اپنے ملک کی نمائندگی کی۔ کیونکہ میں نے پاکستان کے بارے میں لوگوں کی کئی غلط فہمیوں کو دور کیا اور دنیا بھر سے آنے والے لوگوں کو یہ باور کرایا کہ پاکستانی خواتین باختیار، مضبوط اور پختہ عزم کی مالک ہیں۔ ■

RAISING AWARENESS TO MOVE FORWARD

By Huma Choudhary, Express Tribune
Photo Journalist, Pakistan

آگے بڑھنے کیلئے شعور کی بیداری

تحریر: ہما چوہدری، فوٹو جرنلسٹ ایکسپریس ٹریبون



I'm one of the very few female photojournalists working in Pakistan. I have a degree in Marketing from Lahore School of Economics and didn't study photography formally – only some online courses. However, I had a deep passion for photography. I've previously worked at a bank and for the development sector but I felt I wasn't making much of a difference, hence moved to journalism.

Social documentary photography, particularly relating to human rights is a subject very close to my heart because human rights is a major area of concern in my country. I believe raising awareness is the first step towards moving forward and to that effect, photographs tell great stories. Bringing various prevalent human rights issues of my country (such as illiteracy, discrimination based on gender and faith, child labor, health and religious extremism) in the limelight and subsequently playing my role in their alleviation is what motivated me to join this field.

To be honest, there are some advantages of being a female journalist in Pakistan. People trust you with their stories and give you a lot of respect. However, culturally, we do have many issues. Working as a female definitely has more challenges compared to the men in the industry. Right from the behavior of certain close-minded individuals to the attitude of colleagues, from harassment, to some having a perception that you're incapable of understanding things since you're a woman, are some issues I being a female journalist have faced.

As far as photojournalism is concerned, it's about capturing the right moment. You should have a good eye, know some camera technicalities, should be willing to photograph in all kinds of situations and conditions, and most of all, have the passion and drive to tell stories through photographs. ■

میں پاکستان میں کام کرنے والی محدودے چند فوٹو جرنلسٹس میں سے ایک ہوں۔ میں نے لاہور اسکول آف اکنامکس سے مارکیٹنگ میں ڈگری حاصل کی ہے اور فوٹو گرافی کا باقاعدہ مطالعہ نہیں کیا ہے بلکہ آن لائن چند کورسز کئے ہیں۔ تاہم مجھے فوٹو گرافی کا بے حد شوق ہے۔ اس سے پہلے میں نے ایک بینک میں اور ترقی کے شعبے میں کام کیا لیکن جب میں نے محسوس کیا کہ میں کوئی تبدیلی نہیں لاپا رہی تو میں نے صحافت کا رخ کر لیا۔

سماجی و دستاویزی فوٹو گرافی خاص طور پر انسانی حقوق سے متعلق عکاسی مجھے بہت پسند ہے کیونکہ میرے ملک میں انسانی حقوق کی صورت حال خاصی مندو شہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ آگے بڑھنے کے لئے شعور کی بیداری، پہلا قدم ہوتی ہے اور تصاویر بڑی اہم کہاں بیان کرتی ہیں۔ اپنے ملک میں انسانی حقوق کی صورت حال (خاص طور پر تعلیم کا فقدان، صنف یا مذہب کی بنیاد پر امتیازی سلوک، بچوں سے کام کرنا، سحت اور مذہبی انتہا پسندی) سب پر عیاں ہے۔ اس لئے اس صورت حال میں بہتری لانے کی غرض سے میں نے اس شعبے کا انتخاب کیا ہے۔

اگرچہ کہا جائے تو پاکستان میں ایک خاتون صحافی کے طور پر کام کرنے کے بہت سے فوائد ہیں۔ لوگ اپنے دل کی بات کہنے کے لئے آپ پر اعتماد کرتے اور آپ کی بہت عزت کرتے ہیں۔ تاہم معاشرتی اعتبار سے بہت سے مسائل ہیں۔ یقیناً اس صنعت میں مردوں کے مقابلے میں خواتین کو کام کرنے میں زیادہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کچھ تنگ نظر افراد کے طرز عمل سے لے کر ساتھ کام کرنے والوں کے رویے تک، ہراساں کئے جانے اور یہ خیال رکھنے والوں کے ساتھ واسطہ پڑنے تک کہ آپ خاتون ہونے کے ناطے معاملات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ مجھے ان سارے مسائل سے سابقہ پڑ چکا ہے۔

جہاں تک فوٹو جرنلزم کا تعلق ہے تو یہ صحیح وقت پر تصویر لینے کا دوسرا نام ہے۔ آپ کا مشاہدہ بہت تیز ہونا چاہیے اور آپ کو کیمرے کی ساخت اور کام کا پتہ ہونا چاہیے۔ ہر طرح کے مواقع اور صورت حال میں فوٹو گرافی کے لئے تیار رہنا ضروری ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کو تصاویر کے ذریعے خبریں دینے کا شوق اور جذبہ ہو۔ ■

The phone pings. It must be time to get up. It's still dark out but its winter and the alarm is meant to be early. It's breaking news from the BBC app and not the alarm. I must change the setting. It's only 1:30am in Los Angeles.

فون پر لگے الارم کی آواز گونجی تو میں نے سوچا کہ اب اٹھنے کا وقت ہو گیا ہوگا۔ اگرچہ باہر ابھی اندھیرا ہے لیکن سردیوں کے دن ہیں۔ اور الارم کا مطلب یہ ہے کہ مجھے جلدی کرنی چاہیے۔ یہ بی بی سی ایپ پر بریکنگ نیوز تھی الارم نہیں تھا۔ مجھے اس کی آواز تبدیل کرنا ہوگی۔ ابھی لاس اینجلس میں رات کا ڈیڑھ بج رہا ہے۔

HOLDING ON TO

THESE ORDINARY DAYS

CHARLIE GROSSO, PHOTOGRAPHER, CINEMATOGRAPHER AND DIRECTOR, U.S.

تحریر: چارلی گراسو، امریکی فوٹو گرافر، سینیماٹو گرافر اور ڈائریکٹر

یہ عام روز و شب

145 people are dead in a terrorist attack. Taliban. Peshwar. Dead school children. The objective is to kill as many as possible. This is not about hostages and demands. Terror.

There is a sense of disconnect as I head further and further out into the world, partially for work, more probably because of this fire fueling my insides. I'm finding less and less common ground between friends and myself. New friends who will understand and share a conversation about the world at this level haven't shown up yet. This is intermission and I'm standing at the concession alone. I head out to see, experience and report on the world up close. Where I've traveled -- "you must meet her, she just got back from Pakistan," -- makes me a great dinner party guest, but a lousy conversationalist. Trivial and frivolous gets harder and harder. At a good friend's wedding recently, I caught myself reading BBC headlines instead of paying attention to the celebration of her happiness.

There is no recrimination. My friends are lovely. They are educated, smart, well informed and cultured --- except we will always be creatures reacting to our environment --- the business of Hollywood and Entertainment, the ups and downs of Advertising and Start Ups, the struggles of being artists and freelancers. That is their world. The 8000 peaks of Gilgit-Baltistan, the fear that hangs in the air in Peshawar or boys playing soccer in the polo fields during their lunch break are an abstraction.

It's different now --- when you've seen it up-close. When you can picture the children in their school uniforms, Shalwar Kameez with dark green sweaters over it and baseball caps, before you see photos from the wire report. It's different when you can locate the city on a map, when you've been there or not far from it. It's not that you have something to say and no one is listening, but rather that you can attach names and faces and smiles and scents to the place.

Back in Los Angeles and New York City, friends ask, how was Pakistan? Good, I reply. There is a moment of hesitation. The follow up question hangs in the air, unformed; they don't know what to ask or are afraid to ask. They are worried the narrative would be too much. The first class warmth and hospitality of the Pakistanis would humanize these strangers; the brutality and chaos of terrorism would make the listeners feel helpless. So we move on. Rwanda, Uganda, Burma, Turkmenistan... doesn't matter which country I've just returned from; the foreign is sidelined for the familiar. It's a shame to reduce the plight, the beauty, complexity and history of any place to a four-letter word. Good.

It's also not unusual to get asked about life in America by a foreigner. It's hard to know where to start. Do you start with the basics, clean drinking water and high level of sanitation standards, or do you start with the growing conservatism of the Republican Party, the erosion of civil liberty since the Patriot Act and the illegal wiretapping revealed by Edward Snowden? Do we celebrate the world-class eco-system that is Yellowstone National Park or we talk about race, poverty and obesity? I pause. There are too many options and headlines within my grasp. Good, I say, and add a near invisible shrug to encompass all else. The person who asked the question seems satisfied. I've just confirmed his imagining of America. Nothing more is needed.

How far will we get with such simplistic answers? Everyone is holding on to their ordinary days. The beauty within the political volatile, the fear and the senseless within the ideal, are beyond 140 characters, one-word answers and a briefing memo. Will we ever take the time to listen? Will we be brave enough to ask for the narrative? And to tell the whole complicated elaborate story? So you can taste the blackberry syrup from Hunza Valley, hear the traffic on the streets of Rawalpindi and start to grapple at the complexity in a place as big as America?

I hope so. I hope you will ask; I hope we will be brave enough to tell you the whole story and you will patient enough to listen. ■

اس دہشت گردانہ حملے میں ایک سو بیسٹالیس افراد جاں بحق ہو چکے ہیں۔ طالبان نے پشاور میں سکول کے بچوں کو نشانہ بنایا اور ان کا مقصد زیادہ سے زیادہ بچوں کو مارنا تھا۔ یہ کسی کو یرغمال بنا کر اپنے مطالبات منوانے کی کوشش نہ تھی۔ بلکہ دہشت پھیلا نا مقصود تھی۔ میں جوں جوں کسی حد تک کام کے لئے اس دنیا میں آگے بڑھتی گئی تو مجھے لاطعلق کا احساس شدت سے ستانے لگا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ آگ مجھے اندر سے جلانے جارہی تھی۔ میرے اپنے اور میرے دوستوں کے درمیان اقدار مشترک کم سے کم ہوتی گئیں۔ ایسے نئے دوست جو دنیا کے اس مرحلے کے بارے میں میری بات سمجھ سکیں اور گفت و شنید کر سکیں۔ ابھی سامنے نہیں آسکے ہیں۔ یہ ایک وقفہ ہے اور میں اس دورا ہے پر اکیلی کھڑی ہوں۔ میرا کام اس دنیا کو قریب سے دیکھنا، اس کا تجربہ کرنا اور اس بارے میں رپورٹ کرنا ہے۔ میں جن جگہوں کا سفر کر چکی ہوں۔ ان کی وجہ سے مجھے رات کے کھانے کی بڑی بڑی دعوتوں میں مہمان بنایا جاتا ہے اور لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ آپ کو ضرور اس سے ملنا چاہئے وہ ابھی ابھی پاکستان سے آئی ہے اور بہت خوش گفتار ہے۔ ادنیٰ اعتراضات کرنے والے بڑھتے جا رہے ہیں۔ حال ہی میں ایک اچھی دوست کی شادی میں، میں نے اپنے آپ کو اپنی دوست کی خوشی میں شریک ہونے کے بجائے بی بی سی کی ہیڈ لائنز پڑھتے ہوئے پایا۔

یہ کوئی الزام ترشی نہیں ہے۔ میرے دوست بہت پیارے ہیں۔ وہ تعلیم یافتہ، مہذب، خوبصورت اور معلومات سے بھر پور ہیں۔ اسٹنی صرف یہ ہے کہ ہم ہمیشہ سے ایسی مخلوق ہیں جو ہالی ووڈ اور تفریح کے کاروبار، اشتہارات کی دنیا کے آثار چڑھاؤ، نئے کاموں کا آغاز، فنکار اور فری لانسرز ہونے کی جدوجہد جیسے امور پر اپنے ماحول کی مناسبت سے رد عمل ظاہر کرتی ہے۔ یہ ان کی دنیا ہے۔ گلگت بلتستان کی آٹھ ہزار چوٹیاں، پشاور کی فضا میں پھیلا ہوا خوف و ہراس یا پولو کے میدان میں کھانے کے وقفے میں فٹبال کھیلنے والے لڑکے، تجربیڈی آرٹ کے نمونے ہیں۔

اب یہ سب کچھ بدل چکا ہے۔ جب آپ نے اسے قریب سے دیکھا تھا۔ جب آپ خبر رساں ادارے کی رپورٹ میں تصاویر دیکھنے سے پہلے، اسکولوں کی یونیفارم شلوار قمیص اور سبز سوئزر اور بیس بال کیپ پہنے بچوں کی تصاویر لے سکتی تھیں۔ جب آپ کسی فنٹے میں اس شہر کی نشاندہی کر سکتی تھیں، جب آپ یہاں یا اس کے قریب وجوار میں تھیں۔ ایسا نہیں ہے کہ آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں اور کوئی سننے والا نہیں بلکہ آپ اس مقام کے ساتھ ناموں، چہروں، مسکرائیوں اور خوشبو و مسک کر سکتی ہیں۔ نیو یارک اور لاس اینجلس کے دوست پوچھتے ہیں۔ پاکستان کیسا تھا؟ بہت اچھا۔ میرا یہی جواب ہوتا ہے۔ پھر جھجک کا ایک لمحہ ہوتا اور اگلے رے ربط سوال فضا میں گونج رہا ہوتا ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ کیا سوال کیا جائے یا وہ سوال پوچھنے سے ڈرتے ہیں۔ وہ خوفزدہ ہیں کہ شاید داستان بہت طویل ہوگی۔ پاکستانیوں کی بہترین گرم جوشی اور مہمان نوازی ان انجینیئروں کے دل چھو لے گی۔ دہشت گردی کے ظلم اور افراتفری کے ذکر سے سامعین خود کو بے بس محسوس کرنے لگیں گے۔ اس لئے ہم آگے بڑھتے ہیں۔ راندا اور ایو یا یوگنڈا، برما ہو یا ترکمانستان، اس بات سے قطع نظر کہ میں کس ملک سے حال ہی میں لوٹ کر واپس آئی ہوں۔ انجینیئروں کو جانے پہچانے مقامات کی وجہ سے ایک طرف کر دیا جاتا ہے۔ یہ بہت ہی شرم کی بات ہے کہ کسی مقام کی خوبصورتی، تاریخ، تنوع، مسائل اور حالت زار کو ایک چارہرئی لفظ "اچھا" کہہ کر بات تمام کر دی جائے۔

میرے شیلف پر ایک کتاب 'Waiting for an Ordinary Day: The Unraveling of Life in Iraq' پڑی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے جسے میں نے پڑھنا شروع تو کیا تھا لیکن پھر مجھے اور کاموں میں مصروف ہونا پڑا اور یوں وہ ابھی ختم نہیں ہو پائی ہے۔ یہ معروف شخصیت، وہ ٹی وی شو، یہ نیارہستوران جیسی ادنیٰ اور معمول کی باتوں اور ان میں اٹھنے والوں کو تختیہ کا نشانہ بنانا تو آسان ہے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اگر کوئی اپنے عام سے شب و روز کو ٹھوڑا طویل دینے کا خواہشمند ہو؟

کسی غیر ملکی کی طرف سے امریکہ میں زندگی سے متعلق سوال پوچھنا ایک عام سی بات ہے لیکن اس جواب کا آغاز کہاں سے کیا جائے۔ اس بات کا تعین کرنا مشکل ہے۔ کیا آپ بنیادی باتوں سے یعنی پینے کے صاف پانی، اور صفائی کے اعلیٰ معیار سے اپنا جواب شروع کریں گے۔ یا آپ ریپبلکن پارٹی میں بڑھتی ہوئی قدامت پرستی، پیٹریاٹ ایکٹ کے نفاذ کے بعد سے سکڑتی ہوئی شہری آزادیوں اور ایڈورڈ سنوڈن کی طرف سے غیر قانونی ریکارڈنگ کے بارے میں انکشافات پر بات کریں گے؟ کیا ہم بلوسٹون نیشنل پارک میں تشکیل دیے جانے والے عالمی معیار کے ماحولیاتی نظام پر جشن منائیں گے یا ہم غربت، رنگ و نسل اور مونا لوزیر ریخت لائیں گے؟ مجھے توقف کرنا ہوگا۔ میری گرفت میں بہت سی شہ سرخیاں اور موضوعات کے انتخاب کے مواقع ہیں۔ میں کہوں گی۔ بہت اچھا۔ اور پھر غیر محسوس انداز میں کندھے اچکاتے ہوئے سب کو اپنی گرفت میں لے لوں گی۔ جس شخص نے سوال پوچھا ہو گا وہ مطمئن نظر آئے گا۔ میں نے تو صرف امریکہ کے بارے میں اس کے تصورات کی تصدیق کی ہوگی۔ اور اس سے زیادہ کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

ہم تک اس طرح کے سادہ جوابات دیتے رہیں گے؟ ہر کوئی اپنے عام شب و روز گزارنے کا خواہشمند ہے۔ سیاسی آثار چڑھاؤ میں پائی جانے والی خوبصورتی، انجینئرنگ کے ساتھ وائٹ خوف اور بے حسی، یک لفظی جوابات، 140 حروف اور حوالوں کے لئے ایک یادداشت سے زائد ہیں۔ کیا ہم کبھی ہمدتن گوش ہونے کے لئے وقت دے سکیں گے؟ کیا ہم حکایات سننے کا حوصلہ رکھتے ہیں؟ اور مکمل پیچیدہ مفصل کہانی بیان کرنے کی ہمت کر سکتے ہیں؟ آپ وادی ہنزہ کی کالی بیڑیوں کے شربت سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ راولپنڈی کی سڑکوں پر چلنے والی گاڑیوں کی آوازیں سن سکتے ہیں۔ اور پھر امریکہ جیسے بڑے ملک کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کی کوشش فرما سکتے ہیں؟

مجھے امید ہے کہ ایسا ہوگا۔ مجھے توقع ہے کہ آپ پوچھیں گے۔ مجھے امید ہے کہ ہم میں اتنی جرات ہوگی کہ ہم پوری کہانی بیان کر سکیں اور آپ میں اتنا حوصلہ ہوگا کہ اسے سن سکیں۔ ■

MY POST-FEMINIST VIEW ON THE REPRESENTATION OF WOMEN IN MEDIA

By Dr. Rakshinda Perveen

Social Entrepreneur, Gender and Public Health Specialist, and award-winning producer for series "Gender Watch" on PTV in 2001.

At professional forums, I introduce myself as a non-firebrand activist who is not anti-men. I have researched and written about the male role in women's lives, -- especially reproductive health issues-- and I produced the first-ever television show on male gender issues. Despite my emerging scholarship on masculinity, I remain a voice for the diversity and dynamism that women represent.

In all my work - before and behind the camera, writing for newspapers, producing theatre, and engaging on social media - I have learned that in my very interesting and resilient country, the influx of media outlets is the best thing that has happened so far. There are no short cuts to empowering women but the media is definitely one of the shortest and sturdiest routes. In Pakistan's current media landscape, women from diverse backgrounds are creating waves. While there are discriminatory practices within media against women - particularly young women who are more vulnerable to exploitation -- women are occupying this space with speed.

Nevertheless, little attention, if any, is being paid to the image standards imposed on women in leadership roles in the media. For instance, an ageing man is seen as highly intellectual, seasoned and capable to host a current show especially on current affairs but the same is not true for women. I have noted with great concern and displeasure, that even the very few leading women hosts/anchors put on gaudy outwear and makeup when they are interviewing or doing an exclusive show with a VIP in Pakistan.

Global research on women in media has established that women and girls are more excluded than men and boys in the mass media. When they are included, they are silenced or speak less, and when women are characterized in roles, they are often hyper sexualized. Women's Media Center, a U.S. based organization, tracks to what extent the American media allows women to craft their own narrative in public discourse in print and online. Their 2014 report ascertained that the media is both overwhelmingly male and still, alas, overwhelmingly white. This truth is disappointing and unfortunate for all of us, particularly in Pakistan. While there are small, independent studies taking place - put forward by women's rights advocacy non-profits - that correspond with these findings, there has neither been a candid conversation nor any national-level research regarding issues such as class, race, ethnicity, religion, or sex disparities in media. Despite all this, more and young women opt for media related jobs and struggle uncompromisingly to construct bridges within institutional, cultural and functional barriers - often with patriarchy as the common foundation. ■

ذرائع ابلاغ میں خواتین کی نمائندگی کے حوالے سے تحریک نساؤں کے بعد میرے خیالات

تحریر: ڈاکٹر رخشندہ پروین

سماجی کارکن، ماہر صحت عامہ و صنفی امور اور 2001ء میں پی ٹی وی کے لئے ایوارڈ یافتہ سیریز "جینڈر واچ" کی پروڈیوسر۔

میں پیشہ ورانہ فورمز پر اپنے آپ کو ایک ایسی متحمل اور صبر و برداشت والی کارکن کی حیثیت سے متعارف کراتی ہوں جو مردوں کے خلاف نہیں ہے۔ میں نے خواتین کی زندگی میں مردوں کے کردار، خاص طور پر حمل سے متعلق صحت کے جملہ امور کے حوالے سے بہت تحقیق کی ہے اور اس پر لکھا ہے۔ میں نے مردوں کی صنف کے بارے میں ٹیلی ویژن پر پہلا پروگرام کیا تھا۔ مردوں کے حوالے سے اپنے آنے والے علمی کام کے باوصف میں اس توغ اور ہمہ گیریت کی بات کرتی ہوں جو خواتین کا طرہ امتیاز ہے۔

کیرے کے سامنے اور اس کے پس پشت اپنے تمام کاموں میں یعنی اخبارات کے لئے لکھتے ہوئے، تبصرے پر کھیل چبھ کر تے ہوئے اور سوشل میڈیا پر مصروفیت کے دوران میں مجھے یہ احساس ہوا کہ میرے اس دلچسپ اور چمک رکھنے والے ملک میں اب تک سب سے بہتر جو کام ہوا ہے وہ ذرائع ابلاغ کے مختلف اداروں کا قیام اور ان کی بھرمار ہے۔ خواتین کو بااختیار بنانے کا کوئی شارٹ کٹ نہیں ہے، لیکن یقیناً ذرائع ابلاغ اس مقصد کے لئے اختیار کئے جانے والے راستوں میں سب سے مختصر اور بہتر راہ ہے۔ پاکستان میں ذرائع ابلاغ کے موجودہ منظر نامہ میں متنوع پس منظر رکھنے والی خواتین مد و جذر پیدا کر رہی ہیں۔ اگرچہ ذرائع ابلاغ میں خواتین کے خلاف امتیازی سلوک کیا جاتا ہے خاص طور پر نوجوان خواتین کے ساتھ، جو کہ استحصال کا زیادہ نشانہ بنتی ہیں، لیکن اس کے باوجود خواتین بہت تیزی سے اپنی جگہ بنا رہی ہیں۔

بہر حال ذرائع ابلاغ میں قائدانہ کردار کے حوالے سے خواتین پر مسلط کئے گئے ظاہری شخصیت کے جو معیار پر کچھ خاص توجہ نہیں دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ایک بوڑھا، سر پر گنجانے، بے ڈھنگا مرد بہت بڑا دانشور، سمجھ دار اور لائیو پروگرام، خاص طور پر حالات حاضرہ کے موضوعات پر لائیو شو کرنے کے لئے موزوں سمجھا جاتا ہے لیکن اس طرح کی خواتین کو ایسا کرنے کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت تکلیف اور توشیح ہوتی ہے کہ چوٹی کی چند خواتین میزبانوں کو پاکستان میں انٹرویو کرنے یا کسی خاص شخصیت کے ساتھ پروگرام کرنے کے لئے بھڑکیلے لباس پہننا اور شوخ میک اپ کرنا پڑتا ہے۔

ذرائع ابلاغ میں خواتین کی موجودگی کے بارے میں عالمی تحقیق نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ مردوں اور لڑکوں کے مقابلے میں خواتین اور لڑکیوں کو ذرائع ابلاغ پر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ جب ان کو شامل کیا جاتا ہے تو انہیں خاموش رہنے یا کم سے کم بولنے کو کہا جاتا ہے اور جب خواتین کو کسی کردار میں دکھانا مقصود ہوتا ہے تو وہ اکثر انتہائی جنس زدہ ہوتا ہے۔ امریکہ کے ایک ادارے وومن میڈیا سنٹر نے یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ امریکی ذرائع ابلاغ، خواتین کو اخبارات و رسائل اور آن لائن ذرائع پر کس حد تک اپنے اسلوب بیان میں عوام تک اپنی بات کا ابلاغ کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ اس ادارے کی 2014ء کی رپورٹ کے مطابق ذرائع ابلاغ اب بھی بڑی حد تک مردوں اور خاص طور پر سفید فام مردوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ حقیقت ہم سب کے لئے، بالخصوص پاکستان میں بد قسمتی کی بات اور مایوس کن امر ہے۔ اگرچہ ہمارے ہاں خواتین کے حقوق کے لئے کام کرنے والے غیر منافع بخش اداروں کی جانب سے چھوٹے پیمانے پر، اپنے طور پر کی گئی تحقیق کے نتائج بھی اسی سے ملتے جلتے ہیں لیکن ابھی تک قومی سطح پر طبقے، نسل، مذہب یا جنس کی بنیاد پر ذرائع ابلاغ میں روا رکھی جانے والی ناہمواریوں پر نہ تو کوئی عالمی تحقیق کی گئی ہے اور نہ ہی ان امور پر کوئی بنیاد پر بحث ہو سکی ہے۔ ان تمام حقائق کے باوجود بڑی تعداد میں نوجوان خواتین ذرائع ابلاغ سے متعلق ملازمتوں کی طرف آ رہی ہیں اور کوئی سمجھوتہ کے بغیر پدراشاہی انداز فکر کی حامل ادارتی ثقافتی اور عملی رکاوٹوں کو عبور کرنے کی جدوجہد کر رہی ہیں۔ ■

NEW YORK, BEYOND

By Kris Clark

تحریر: کرس کلارک

Although separated by more than 11,000 kilometers of land and ocean, the “Land of the Pure” and the “Empire State” share more in common than would be apparent at first glance. Pakistani visitors would identify with New York’s varied geographical features, the contrast between urban and village life, state/national parks and wildlife sanctuaries, world heritage sites, and tremendous ethnic and linguistic diversity.

Contrary to popular perceptions, the vast majority of New York’s geography comprises farms, forests, rivers, mountains, and lakes. Two large, rugged mountain ranges dominate the upstate area – the Catskills and the Adirondacks. (The tallest peak in New York – Mount Marcy in the Adirondacks – is dwarfed by Pakistan’s K2, at more than four times the height!) The state’s borders hug two of North America’s Great Lakes – Erie and Ontario – both of which are connected by the Niagara River, ending in the world famous Niagara Falls.

Many visitors would be surprised at the small villages which dot the landscape in parts of the Hudson River Valley and in the Finger Lakes region of Upstate New York. Reminiscent of small-town “Americana,” the region’s rocky, deep, and fertile soils would be familiar to Pakistani farmers, producing crops such as dairy, apples, cherries, cabbages, potatoes, onions.

Like Pakistan, New York values its national and state parks, as well as its wildlife sanctuaries. The largest park in the continental U.S.—larger than Yosemite or the entire state of Massachusetts—the six-million-acre Adirondack State Park is legally protected to remain “forever wild”. The Adirondack Park contains thousands of streams, brooks and lakes, most famously Lake Placid, adjacent to the village of Lake Placid, two-time site of the Olympic Winter Games.

Both Pakistan and New York are home to two of the largest cities on the planet – Karachi and New York City. As Karachi is to Pakistan, New York City was once the capital of and remains the most populous city in the United States. Home to the United Nations, New York City is a global capital of culture, finance, technology, trade, entertainment, and education. New York City is one of the world’s most visited cities (to the tune of more than 50 million annual visitors) and is home to many famous districts and landmarks including Times Square, Broadway, and Wall Street.

اگرچہ ”پاک سرزمین“ اور ”ایمپائر سٹیٹ“ کے درمیان بروجیو پر مشتمل گیارہ ہزار کلومیٹر کا فاصلہ ہے لیکن ان دونوں کے درمیان بہت سی اقدار مشترک ہیں جو پہلی نظر میں دکھائی نہیں دیتیں۔ پاکستان سے آنے والے سیاح نیویارک کی شناخت کے طور پر اس کے مختلف جغرافیائی پہلو، شہری اور دیہی زندگی میں پائے جانے والے تضاد، ریاستی اور قومی پارکس اور جنگلی حیات کی محفوظ پناہ گاہیں، عالمی ورثہ قرار دی جانے والی جگہیں اور بے تحاشہ نسلی اور لسانی تنوع پائیں گے۔

عام خیال کے برعکس نیویارک کے جغرافیہ میں کھیت، جنگل، دریا، پہاڑ اور جھیلیں شامل ہیں۔ ریاست کے بالائی علاقے میں دو سنگلاخ پہاڑی سلسلہ دی کیٹ سکو اور اڈیرونڈیکس پھیلے ہوئے ہیں۔ (نیویارک کی سب سے اونچی چوٹی ماؤنٹ مری سلسلہ ہائے کوہ اڈیرونڈیکس کا حصہ ہے یہ چوٹی پاکستان کے سب سے اونچے پہاڑ کے ٹوکے مقابلے میں ہونگتی ہے کیونکہ اس کی اونچائی ماؤنٹ مری سے چار گنا زیادہ ہے) ریاست کی سرحد میں امریکہ کی دو بڑی جھیلیں ایری اور انٹاریو کے ساتھ بغل گیر ہوتی ہیں۔ یہ دونوں جھیلیں دریائے نیوگرا کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ جو معروف آبشار نیوگرا میں مدغم ہو جاتا ہے۔

دریائے ہڈسن کی وادی اور قنار جھیلوں والے ریاست نیویارک کے بالائی علاقے میں پھیلے ہوئے چھوٹے چھوٹے دیہات کو دیکھ کر بہت سے سیاح حیران ہوں گے۔ چھوٹے سے گاؤں ”امریکانا“ کی طرح علاقے کی چٹانی، گہری وادیوں پر مشتمل زرخیز زمینیں پاکستانی کسانوں کو دیکھی بھالی محسوس ہوں گی۔ جن میں سیب، چیری، گوبھی، آلو اور پیاز اگائے اور دوڑ دھننے والے مال مویشی پالے جاتے ہیں۔

پاکستان کی طرح نیویارک بھی اپنے ریاستی اور قومی پارکس اور جنگلی حیات کی محفوظ پناہ گاہوں کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ ساٹھ لاکھ ایکڑ پر پھیلا ہوا براعظم امریکہ کا سب سے بڑا پارک Adirondack State Park جو یوٹا اور پوری ریاست میساچوسٹس سے رقبے میں بڑا ہے۔ اس پارک کو ہمیشہ کے لئے اپنی قدرتی حالت میں رکھنا قانونی طور پر لازم قرار دیا جا چکا ہے۔ Adirondack State Park میں ہزاروں کی تعداد میں ندیاں، چشمے اور جھیلیں ہیں جن میں جھیل پلینڈ جو کہ اسی نام کے گاؤں کے ساتھ واقع ہے، سرمایہ اولمپک کھیلوں کے مقام سے دو گنا بڑی ہے۔

ریاست نیویارک اور پاکستان میں خطہ ارضی کے دو سب سے بڑے شہر کراچی اور نیویارک شہر آباد ہیں۔ جس طرح کراچی پاکستان کا دار الحکومت رہا اور سب سے بڑا شہر ہے، اسی طرح سے نیویارک بھی کبھی امریکہ کا دار الحکومت تھا اور امریکہ کا سب سے گنجان آباد شہر۔ اس وقت امریکہ کا صدر دفتر بھی یہیں واقع ہے۔ نیویارک شہر عالمی ثقافت، معیشت، ٹیکنالوجی، تجارت، تفریح اور تفریح کی مرکز ہے۔ نیویارک شہر دنیا بھر میں سب سے زیادہ سیاحوں کی منزل

YOND THE CITY

نیویارک، شہر سے پرے

While Pakistan has six UNESCO World Heritage Sites (including Taxila, Rohtas Fort, and Lahore's Fort and Shalamar Gardens), New York has only one – the Statue of Liberty. The Statue of Liberty was a gift of friendship from the people of France on the 100th anniversary of American independence in 1876, dedicated on October 28, 1886. Standing at the entrance to New York Harbor, the statue is an icon of freedom and of the United States: it has welcomed millions of immigrants from around the world to the United States. Many of those immigrants have come from Pakistan; the greater New York City area holds the largest concentration – more than 25 percent – of all Pakistanis who have immigrated to the United States. ■

Kris Clark is the Staff Aide for the Ambassador at the U.S. Embassy in Islamabad. He is originally from Queens, New York.

ہونے کا اعزاز بھی رکھتا ہے۔ (یہاں سالانہ پانچ کروڑ سے زیادہ سیاح آتے ہیں) بہت ہی معروف جگہیں مثلاً ٹائٹن سکوئر، براؤوے اور وال سٹریٹ یہیں واقع ہیں۔

پاکستان میں یونیسکو کی طرف سے عالمی ورثہ قرار دیئے جانے والے چھ مقامات ہیں۔ (جن میں ٹیکسلا، قلعہ روہتاس، لاہور کا قلعہ اور شالامار باغ شامل ہیں) ان کے مقابلے میں نیویارک میں صرف ایک جگہ۔ مجسمہ آزادی۔ کو عالمی ورثہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہ مجسمہ آزادی فرانس کے عوام کی طرف سے امریکی عوام کو 1876ء میں آن کی آزادی کے سو برس پورے ہونے کی خوشی میں دوستی کے ایک تحفے کے طور پر 28 اکتوبر 1886ء کو دیا گیا تھا۔ نیویارک بندرگاہ کے داخلی راستے پر نصب یہ مجسمہ امریکہ اور اس کی آزادی کا مظہر ہے۔ اس نے دنیا کے مختلف علاقوں سے امریکہ نقل مکانی کرنے والے کروڑوں لوگوں کو خوش آمدید کہا ہے جن میں بہت سے تارکین وطن پاکستان سے آئے تھے۔ امریکہ نقل مکانی کرنے والے پاکستانیوں کی ایک کثیر تعداد یعنی امریکہ منتقل ہونے والے پاکستانیوں کی کل تعداد کا پچیس فیصد نیویارک شہر اور اس کے نواحی علاقوں میں آباد ہے۔ ■

کرس کلارک امریکی سفارت خانہ اسلام آباد میں سفیر کے سٹاف اسٹنٹ ہیں۔ وہ بنیادی طور پر نیویارک کے علاقے کوئیز سے تعلق رکھتے ہیں۔

MEDIA SNAPSHOT:

NEW YORK'S FEMALE BLOGGERS AND THE TAKEOVER OF FASHION MEDIA

ذرائع ابلاغ کا منظر نامہ:

نیویارک کی خواتین بلاگرز اور فیشن کی دنیا پر ان کی حکمرانی

By Kelia Cummins

تحریر: کیلیا کمینس

New York is home to fashion; as such the world's major fashion magazines, fashion-related photography, and designer inspirations originate on its streets. Just walk down any avenue in New York City for a glimpse into emerging trends. To keep up with fashion's ever-changing palettes and themes, fashion blogging has taken the world by storm. Female bloggers (blog authors) have taken the lead with this modern fashion media platform.

Fashion blogs often feature shopping editorials on the most cutting-edge fashion trends, provide real-time updates on fashion news, and interview fashion personalities. Bloggers post photographs of themselves wearing various outfits and accessories, allowing users to see (and perhaps try for themselves) several ways to wear new trends. Some bloggers are also amateur or professional photographers, and use their blogs to photograph others on the streets of New York wearing innovative, creative, fashion-forward styles. The ultimate compliment for a New York woman is to be stopped on the street by an established blogger and featured in one of their daily posts.

Bloggers have become such an important element in fashion media that they can be found seated front row at all of the major fashion design runway

نیویارک فیشن کا گھر ہے۔ کیونکہ وہاں سے دنیا کے معروف فیشن کے رسالوں، فیشن سے متعلق فوٹو گرافی اور ڈیزائنرز کی وجہ سے جو تخلیق پھوٹی ہے وہ اُس کی سڑکوں پر نظر آتی ہے۔ نئے اُبھرتے ہوئے رجحانات کا جائزہ لینے کے لئے نیویارک کے کسی بڑے چوراہے پر ایک مزگشت کافی ہے۔ فیشن کی دنیا میں در آنے والی نت نئی تبدیلیوں اور ماحول کے ساتھ ساتھ رہتے ہوئے فیشن بلاگرز نے دنیا میں طوفان برپا کر رکھا ہے۔ بلاگ لکھنے والی خواتین جدید فیشن کے اس ذریعہ ابلاغ پر آگے آگے ہیں۔

فیشن بلاگرز میں اکثر و بیشتر خریداری کے رجحانات کی عکاسی کرنے والا ادارہ، جدید ترین فیشن کے طور طریقے، فیشن کی دنیا کی تازہ ترین خبریں اور فیشن سے متعلق شخصیات کے انٹرویوز شامل ہوتے ہیں۔ بلاگرز مختلف جدید لباس اور اُن کے ساتھ کے آرائشی پہناؤوں کے ساتھ اپنی تصاویر بھی پوسٹ کرتی ہیں۔ اس طرح سے بلاگ پڑھنے والوں کو نت نئے لباس اور اُن کے مختلف انداز دیکھنے کو ملتے ہیں۔ (اور وہ خود بھی ان لباسوں کو پہن کر پرکھ سکتے ہیں)، کچھ بلاگرز پیشہ ورانہ یا شوقیہ فوٹو گرافر بھی ہوتی ہیں۔ وہ اپنے بلاگرز میں نئی تراش خراش اور سٹائل والے جدید لباس پہن کر نیویارک کی سڑکوں پر گھومنے والوں کی تصاویر بھی شامل کرتی ہیں۔ نیویارک کی کسی بھی عورت کے لئے یہ بہت

shows, including the world-famous Mercedes Benz New York Fashion Week. Designers featured on the most popular blogs can see their business explode overnight, as the best blogs can garner over 4 million page views per month. Advertisers have also acknowledged the power and influence of fashion blogs; accordingly, several female fashion bloggers have become self-made millionaires from advertising revenue garnered on their websites.

Long gone are the days when the Style Page of the New York Times and established magazines set the pace for fashion. Today's internet generation has found a way to keep up with fashion's transformational changes. From glam to grunge, New York fashion bloggers cover it all. They are the present and future of fashion media.

Judging from the explosion of fashion editorials on Pakistan's daily newspapers, and the colorful magazines bursting with photo exhibitions of the latest fashions from fashion hubs like Karachi and Lahore, I look forward to discovering the local fashion blogs that highlight the hottest Pakistani styles as well! ■

Kelia Cummins is a General Services Officer at the U.S. Embassy in Islamabad. She is originally from Brooklyn, New York.



اعزاز کی بات ہوتی ہے کہ راہ چلنے اُسے کوئی مستند بلاگر روک لے اور اُس کی تصاویر اپنے روزانہ کے بلاگ میں پوسٹ کرے۔

فیشن کی دنیا میں بلاگرز اس قدر اہمیت اختیار کر چکی ہیں کہ اب وہ فیشن ڈیزائن کی بڑی بڑی نمائشوں بشمول معروف مرسیڈیز بینز نیویارک فیشن ویک میں اگلی نشستوں پر بیٹھے نظر آتی ہیں۔ مشہور بلاگرز میں شائع ہونے والے ڈیزائنرز کا کاروبار راتوں رات چمک اُٹھتا ہے۔ کیونکہ اچھے بلاگرز دیکھنے والوں کی تعداد ماہانہ چالیس لاکھ سے تجاوز کر جاتی ہے۔ مشہور ترین بھی فیشن بلاگرز کی رسائی اور طاقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کئی خواتین بلاگرز اپنی ویب سائٹس کے لئے طے والے اشتہارات کی آمدنی سے کروڑ پتی بن چکی ہیں۔ وہ دن گئے جب نیویارک ٹائمز اور دیگر مستند جرائد فیشن کے رجحانات کا تعین کرتے تھے۔ آج کل کی انٹرنیٹ جزیں نے فیشن کی دنیا کے بدلنے ہوئے رجحانات کو جانچنے کا ایک اور طریقہ ڈھونڈ لیا ہے۔ فیشن کی دنیا کی ہر تبدیلی اور گیم کو نیویارک کے فیشن بلاگرز بخوبی کور کرتی ہیں۔ اب وہ فیشن کا موجودہ اور مستقبل کا ذریعہ ابلاغ بن چکی ہیں۔ ■

کیلیا کمینس اسلام آباد کے امریکی سفارت خانے میں جنرل سروس آفیسر ہیں اور اُن کا تعلق نیویارک کے علاقے بروکلین سے ہے۔

PROFILE: OPRAH WINFREY,

tv host, actress, philanthropist

تعارف اوپرا ونفرے

ٹیلی ویژن کی میزبان، اداکارہ اور انسان دوست



Oprah Winfrey attends a special screening of the film *The Butler*, in which she stars.



Oprah walks with members of the first graduating class at the Oprah Winfrey Leadership Academy for Girls in South Africa.

Oprah Winfrey is an American success story. Born into poverty in rural Mississippi in 1954, Winfrey is an enormously successful businesswoman, television host, Academy Award-winning actress, film producer and philanthropist. Best known for her award-winning talk show *The Oprah Winfrey Show*, Winfrey has been ranked the wealthiest African American of the 20th century.

Oprah Gail Winfrey was born to a teenage single mother and endured an extremely difficult childhood. After years of hard work, she received a full scholarship to Tennessee State University. She began working in radio and television broadcasting in Nashville at age 17. By 1984, she was hosting her own morning television show. Winfrey's emotional style and ability to connect with viewers have endeared her to millions of television viewers.

In 2004, Winfrey became the first African American to rank among the 50 most generous American philanthropists. Oprah's Angel Network, a charity she founded in 1998, raised more than \$80 million to support charitable projects and provide grants to nonprofit organizations around the world. Before it stopped accepting donations in 2010, Winfrey personally paid all administrative costs, allowing every penny of raised funds to support charity programs. In addition, she invested \$40 million and devoted personal time to establish the Oprah Winfrey Leadership Academy for Girls near Johannesburg, South Africa. The state-of-the-art school opened in 2007. Its mission is to "equip students with the intellectual and social skills necessary to assume positions of leadership in South Africa and abroad." In 2013, Winfrey donated \$12 million to the Smithsonian National Museum of African American History and Culture, making her the museum's largest contributor to date. The Washington museum is set to open in 2015. ■

(This article was published by the U.S. Department of State's Bureau of International Information Programs.)

اوپرا ونفرے کامیابی کی ایک امریکی داستان کا نام ہے۔ 1954ء میں مسس سپی کے دیہی علاقے میں غربت کے عالم میں آنکھ کھولنے والی اوپرا ونفرے انتہائی کامیاب تاجر، ٹیلی ویژن کی میزبان، اکیڈمی ایوارڈ یافتہ اداکارہ، فلم پروڈیوسر اور انسان دوست خاتون ہیں۔ اپنے ایوارڈ یافتہ ٹاک شو "دی اوپرا ونفرے شو" کے حوالے سے معروف اس خاتون کو بیسویں صدی کی دولت مند ترین افریقی خواتین کا نام دیا گیا ہے۔

اوپرا گیل ونفرے نے ایک تنہا اور نوجوان عمر کے ہاں جنم لیا تھا اور اُس کا بچپن مشکلات سے بھرپور تھا۔ کئی برس کی تکالیف کے بعد اُسے شینیسی سٹیٹ یونیورسٹی کا وظیفہ ملا۔ اُس نے نائش ویل میں سترہ برس کی عمر سے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر کام کرنا شروع کیا اور 1984ء میں وہ ٹیلی ویژن پر اپنے صبح کے شو کی میزبانی کر رہی تھی۔ ونفرے کے جذباتی انداز گفتگو اور ناظرین کو ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیت کی وجہ سے ٹیلی ویژن کے کروڑوں ناظرین اُسے پسند کرتے ہیں۔

2004ء میں اوپرا ونفرے کو امریکہ کے سب سے زیادہ سخاوت کرنے والے پچاس افراد میں پہلی افریقی خواتین کا نام دیا گیا۔ خاتون ہونے کا اعزاز ملا۔ 1998ء میں قائم ہونے والی اوپرا ونفرے کی خیراتی تنظیم "انجیل نیٹ ورک" اب تک آٹھ کروڑ ڈالر جمع کر کے دنیا بھر میں خیراتی منصوبوں اور غیر منافع بخش تنظیموں کو فراہم کر چکی ہے۔ 2010ء میں عطیات کی وصولی روکنے سے پہلے اوپرا ونفرے اپنی تنظیم کے تمام تر انتظامی اخراجات اپنی جیب سے ادا کرتی رہی تاکہ وصول ہونے والے عطیات کی ایک ایک پائی خیراتی منصوبوں پر صرف کی جاسکے۔ اس کے علاوہ اوپرا ونفرے نے جنوبی افریقہ میں جو ہانسبرگ کے قریب "اوپرا ونفرے لیدرشپ اکیڈمی فار گرلز" قائم کرنے کے لئے چار کروڑ ڈالر کی سرمایہ کاری کی اور اپنا ذاتی وقت دیا۔ یہ جدید ترین ادارہ 2007ء میں قائم ہوا۔ اس کا مشن یہ ہے کہ یہاں آنے والی طالبات کو عقل و شعور اور سماجی حوالوں سے اس قدر صلاحیتوں سے بہرہ ور کر دیا جائے کہ وہ جنوبی افریقہ اور دنیا بھر میں کلیدی عہدوں کی ذمہ داریاں سنبھال سکیں۔ 2013ء میں ونفرے نے اسمتھ سونین نیشنل میوزیم آف افریقن امریکن ہسٹری اینڈ کلتچر کو ایک کروڑ بیس لاکھ ڈالر کا عطیہ دیا اور یہ اس میوزیم کی تاریخ میں عطیہ کی جانے والی سب سے بڑی رقم ہے۔ واشنگٹن میوزیم سال رواں میں کھل جائے گا۔ ■

یہ مضمون امریکی محکمہ خارجہ کے بیورو آف انٹرنیشنل انفارمیشن پروگرامز کے تحت شائع کیا گیا۔

RAISING OUR VOICES

DEMANDING REPRESENTATION

By Myra Imran

Joint Secretary for the National Press Club, Islamabad

It was Eid morning in December 2010, when I opened up my e-mail and found it bombarded with threatening messages and rhetoric against women journalists from unknown senders.

The experience shocked me, and I panicked.

My instant response was to respond and explain my position, but that response was not acknowledged. I soon realized that the reason for the threatening messages was my announcement of the creation of a women's journalist association.

Considering the need for a collective voice for their rights, women journalists of Islamabad launched the group "Women Journalists in Pakistan" in November 2010. There is no doubt that professionally, women match their male colleagues and their analytical and investigative skills are quite impressive. They have proven themselves both in the print and the electronic media.

Almost a decade ago, there were very few women in journalism. But things have now changed and with the opening of a string of television channels, many new faces have appeared. These motivated girls have been a valuable addition to Pakistani media.

However, besides a few media houses, the working conditions remain unchanged. While they fight cultural constraints while performing their duties in the field, they also face multiple challenges in the workplace such as low salaries, lack of basic facilities, harassment, organizations reluctant to grant maternity leave, non-existence of daycare centers, and assignment discrimination to name a few.

Women journalists are often the first to become victims of downsizing.

The female journalists are not given much importance in consultative process of policymaking despite the fact that they work in the field and have first-hand knowledge of all social issues. Information about international courses, workshops and seminars rarely reaches the majority of women reporters. And as a result, women journalists are largely ignored in capacity building initiatives for journalists like international training tours and interaction with prominent

تحریر: ماثرہ عمران، جوائنٹ سیکریٹری نیشنل پریس کلب اسلام آباد

دسمبر 2010ء میں عید کی صبح میں نے اپنی ای میل کھولی تو اس میں نامعلوم بھیجنے والوں کی طرف سے دھمکی آمیز پیغامات اور خواتین صحافیوں کے خلاف تحریروں کی بھرمار تھی۔ اس سے میں سکتے میں آگئی اور سخت خوفزدہ ہوئی۔

میرا فوری رد عمل یہ تھا کہ میں نے اپنے جواب میں اپنی پوزیشن کی وضاحت کی لیکن مجھے اس جواب کی کوئی رسید نہ ملی۔ بہت جلد مجھے احساس ہوا کہ یہ دھمکی آمیز پیغامات میری طرف سے ووومن جرنلسٹس ایسوسی ایشن کے قیام کے اعلان کا نتیجہ ہیں۔

اپنے حقوق کے لئے ایک مشترکہ آواز اٹھانے کے لئے اسلام آباد کی خواتین صحافیوں نے نومبر 2010ء میں "ووومن جرنلسٹس ان پاکستان" کے نام سے اپنا ایک گروپ تشکیل دیا تھا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ خواتین صحافی پیشہ ورانہ اعتبار سے اپنے مرد ساتھیوں کے ہم پلہ ہیں اور ان کی تجزیاتی اور تحقیقاتی صلاحیتیں خاصی متاثر کن ہیں اور وہ اپنی لیاقت اخبارات کے ساتھ ساتھ الیکٹرانک میڈیا میں بھی منوار رہی ہیں۔

تقریباً عشرہ بھر پہلے صحافت میں چند ہی خواتین تھیں، لیکن اب صورت حال بدل چکی ہے اور ٹیلی ویژن چینلوں کی بھرمار کی بدولت کئی نئے چہرے دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ یہ پرجوش لڑکیاں پاکستانی ذرائع ابلاغ میں قابل قدر اضافہ ہیں۔

تاہم ذرائع ابلاغ کے چند اداروں کو چھوڑ کر حالات کار میں کچھ خاص تبدیلی نہیں آئی ہے۔ میدان عمل میں اپنی خدمات سرانجام دیتے ہوئے انہیں نہ صرف معاشرتی رکاوٹوں اور پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ وہ اپنی جائے تعیناتی پر کم تنخواہوں، بنیادی سہولیات کے فقدان، زچگی کی چھٹی دینے سے گریزاں انتظامیہ، چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کے مراکز کی عدم دستیابی اور ذمہ داریاں تفویض کرنے میں امتیازی سلوک ایسی مشکلات سے بھی نہر داڑ ماہوتی ہیں۔ کسی ادارے میں چھائی کی صورت میں اس کا سب سے اولین نشانہ خواتین صحافی بنتی ہیں۔

اس حقیقت کے باوجود کہ وہ میدان عمل میں کام کر رہی ہوتی ہیں اور تمام سماجی مسائل سے اچھی طرح آشنا ہوتی ہیں، خواتین صحافیوں کو پالیسیاں بناتے وقت مشاورتی عمل میں کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ بین الاقوامی کورسز، ورکشاپس اور سیمینارز کے حوالے سے معلومات زیادہ تر خواتین رپورٹرز تک نہیں پہنچ پاتیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بین الاقوامی تربیتی دوروں اور اہم شخصیات اور عہدیداروں کے ساتھ میل جول جیسے استعداد کار بڑھانے کے

VOICES,



ON, AND STANDING STRONG

اپنی آواز اٹھاتے ہوئے،

نمائندگی کا مطالبہ کرتے ہوئے ہم ایک ہیں

personalities and dignitaries. Due to all these factors, the retention rate of women journalists remains low.

We wanted to raise our voices and do something about all of these issues as an association, but the threatening messages against women journalists were just the beginning. The defamation campaign fomented doubt, suspicion and misunderstanding among our supporters. As the women journalists group became more passive, we feared it was the end of our group, and we were disappointed.

Nevertheless, at that time, in spite of the negativity being projected by the majority, a support group that was serious about addressing these issues blossomed within the community and encouraged us to become active once again.

Soon a National Women Conference was organized in the National Press Club (NPC) in 2011 where active women journalists played a major role in organizing sessions on downsizing, harassment, and lack of basic facilities for women journalists. Another National Conference of Women Journalists organized by Pakistan Federal Union of Journalists with the support of Aurat Foundation took place in May 2014, where a strong charter demanding reserved seats for women in the executive bodies of mainstream journalistic bodies was drafted and presented.

To our surprise, in December 2014, the constitution of the NPC was amended to include one reserved seat of vice president, one for joint secretary and two in the governing body for women.

The next elections took place on December 27, 2014 in which I was elected unopposed as the Joint Secretary. Even though my detractors were again present, this time I stood fast with the support from within the journalist community.

From this platform, I hope I can serve the community and continue to work for the female journalists in Pakistan. ■

مواقع میں خواتین صحافیوں کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ان تمام وجوہات کی بناء پر خواتین صحافیوں کے اس شعبے میں موجود رہنے کی شرح کم ہے۔

ہم ایک ایسوسی ایشن کی صورت میں ان تمام مسائل پر اپنی آواز اٹھانا اور کچھ کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ لیکن خواتین صحافیوں کے خلاف دھمکی آمیز پیغامات ایک نکتہ آغاز تھے۔ بدنام کرنے کی مہم کی وجہ سے ہمارے حاسیوں میں شکوک و شبہات اور غلط فہمیاں پیدا ہونے لگیں۔ اس صورت حال میں خواتین صحافیوں کا گروپ مزید کم ہوا گیا۔ ہمیں یہ خوف لاحق ہو گیا کہ شاید اب ہمارے گروپ کا خاتمہ قریب ہے۔ یہ حالات بہت مایوس کن تھے۔

بہر حال ایسے وقت میں جبکہ اکثریت کی طرف سے منفی اشارے مل رہے تھے، اپنی برادری میں پیدا ہونے والے ان مسائل کو ختم کرنے میں سنجیدہ ایک حاسی گروپ آگے بڑھا اور ہمیں ایک بار پھر متحرک ہونے کو کہا۔ بہت جلد ہم نے 2011ء میں نیشنل پریس کلب میں ایک نیشنل ڈومین کانفرنس منعقد کی۔ جس میں خواتین صحافیوں کی چھانٹیں، انہیں ہراساں کرنے اور ان کے لئے بنیادی یونٹوں کے فقدان جیسے امور پر خصوصی نشستوں کا اہتمام کرنے میں متحرک خواتین صحافیوں نے فعال کردار ادا کیا۔ خواتین صحافیوں کی ایک اور قومی کانفرنس مئی 2014ء میں عورت فاؤنڈیشن کے تعاون سے پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس نے منعقد کرائی۔ جس میں صحافیوں کی بڑی تنظیموں کی انتظامی کمیٹیوں میں خواتین کے لئے نشستیں مختص کرنے کے حوالے سے مطالبات کی ایک فہرست تیار اور پیش کی گئی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ دسمبر 2014ء میں نیشنل پریس کلب کے آئین میں ترمیم کر کے خواتین کے لئے ایک نائب صدر، ایک جوائنٹ سیکریٹری اور مجلس منتظرہ میں دو نشستیں مخصوص کر دی گئیں۔

اگلا انتخاب 27 دسمبر 2014ء کو منعقد ہوا اور میں بلا مقابلہ جوائنٹ سیکریٹری منتخب ہوئی۔ اگرچہ اس موقع پر میری مخالفت کرنے والے لوگ بھی موجود تھے لیکن صحافی برادری کے اندر اپنی حمایت کی بناء پر میں فخر سے سرواٹھنے کے کھڑی رہی۔

مجھے امید ہے کہ میں اس پلیٹ فارم سے میں اپنی برادری کی خدمت کر سکوں گی اور پاکستان میں خواتین صحافیوں کے لئے کام کرتی رہوں گی۔ ■



ELIZABETH THORP

EDITOR-IN-CHIEF FOR
CAPITOL FILE MAGAZINE

الیزبتہ تھورپ

ایڈیٹر انچیف برائے کیپیٹل فائل میگزین

Please describe your role in media. Include a description of how your work gets done on a daily basis.

I am the editor in chief of Capitol File magazine, the premiere luxury lifestyle magazine in Washington, DC. I am responsible for managing the content of each issue, planning, assigning, and reviewing copy. I also manage photoshoots, photographers, freelancers and our editorial and marketing staff. Currently, we're closing our February issue which means I'm going through a PDF mock-up of each article and making final changes and additions.

How did you come into this role? (Life long dream? Educational background? Career switch?)

I've been in Washington for 22 years and have always been in the public relations, public affairs and journalism space. I had been writing for Capitol File and other magazines on and off for years -- even while running my family travel website -- Poshbrood.com -- and providing travel booking services. So, when they were looking for a new editor in summer of 2013, they asked me if I would talk to them about the opportunity. I declined, happy with Poshbrood work at the time. They asked just for a meeting, where I met my boss

ازراہ کرم ذرائع ابلاغ میں اپنے کردار پر روشنی ڈالنے اور بتانے کہ آپ روزمرہ کا کام کیسے نمٹاتی ہیں؟ میں کیپیٹل فائل میگزین میں ایڈیٹر انچیف ہوں۔ یہ واٹکنٹن ڈی سی میں پرنٹیشن طرز زندگی کا سب سے نمایاں رسالہ ہے۔ میں ہر شمارے کی منصوبہ بندی، کام تفویض کرنے، مواد کے چناؤ اور چھپنے سے پہلے کاپی کا جائزہ لینے کی ذمہ داریاں نبھاتی ہوں۔ میں مارکیٹنگ کے عملے، ادارے، آزاد لکھاریوں، فوٹو گرافرز اور فوٹو شوٹس کی بھی نگرانی کرتی ہوں۔ اس وقت ہم فروری کے شمارے کی تیاری کے آخری مراحل میں ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ میں ہر مضمون کو پی ڈی ایف کی صورت میں پڑھ رہی ہوں تاکہ حتمی تبدیلیاں اور اضافے کئے جاسکیں۔

آپ نے یہ کام کیسے اپنایا؟ (کیا یہ آپ کی دلی خواہش تھی، آپ کا تعلیمی پس منظر ایسا کا تھا، یا آپ نے اپنا پیشہ خود تبدیل کیا؟)

میں گذشتہ پانچ برس سے واٹکنٹن میں رہ رہی ہوں اور اس دوران میں تعلقات عامہ، امور عامہ اور صحافت سے منسلک رہی ہوں۔ میں برسوں کیپیٹل فائل اور دیگر جرائد کے لئے وقتاً فوقتاً لکھتی رہی۔ ساتھ ساتھ میں اپنے گھرانے کی سفری ویب سائٹ چلاتی اور سفر کی بکنگ کی خدمات مہیا کرتی رہی۔ جب یہ رسالہ 2013ء کی گرمیوں میں نئے ایڈیٹر کی تلاش کر رہے تھے تو انہوں نے مجھ سے بھی پوچھا تھا اور میں نے معذرت کر لی تھی۔ کیونکہ میں اپنی ویب سائٹ کے کام سے مطمئن تھی۔ پھر انہوں نے صرف ایک ملاقات کے لئے کہا۔ تو میں اپنی باس مینڈی ناروڈ سے ملی۔ وہ برطانوی ہیں اور برٹش کاسمو سے تعلق رکھتی ہیں۔ مجھے اُن کی مدبرانہ بصیرت نے بہت متاثر کیا اور میں اس رسالے کو بدلنے کا موقعہ حاصل ہونے پر بہت خوش ہوئی۔ پھر بات چیت چلتی رہی اور آخر کار اگست 2013ء میں اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ یہ ایک سنہرا موقعہ تھا اور میں اپنے اب تک کے کام سے اور چھپنے والے مواد کے معیار سے بے حد مطمئن ہوں۔

-- Mandi Norwood. She's British and hailed from British Cosmo. I loved her vision and got very intrigued with the opportunity to turn the magazine around so discussions continued and I took the job in August 2013. It's been a wonderful opportunity and I'm really proud of the work we've done and the great content we produce.

Describe how you feel your work impacts others.

I love celebrating the best of Washington -- there are so many incredibly talented people here it's staggering. I loved our cover with Dr. Jill Biden, wife of Vice President Biden, who not only teaches at Virginia Community College two days a week, while also tirelessly advocating for military families and education. I also saw a lot of positive feedback on the interview I did with Chelsea Clinton on the ivory poaching crisis in Africa. She and her mother, Hillary Clinton, have spearheaded a huge effort to combat elephant poaching and save the species. This piece ran in all twelve of our Niche titles (our parent company) in other markets. I love that we're helping to spread the word and I consider these two interviews my greatest accomplishments in media.

How does what you do shape the American narrative and/or shape American culture?

In many ways, Washington is the most important city in the US. Our magazine is vetted for distribution in The White House, on Capitol Hill and all the embassies so my hope is that our pieces on philanthropic issues, new cultural attractions in Washington, profiles on emerging leaders in business, non profits, public service will be absorbed by our thought leaders.

What are the general challenges of working in the media environment today?

Our budgets are not big, and we have a very streamlined staff. Every print publication is in many ways the underdog because of online media and 24/7 coverage to news. Another challenge with a long lead publication is that you're planning 3-4 months out. Currently, we're already working on our May issue which is not out until the end of April.

Do you believe that being a woman affects your work? Why or why not?

I do believe being a woman affects my work -- in a good way. In my experience, women are more able to juggle, multi task and prioritize. Capitol File is an all-female office.

What is your advice to other young women eager to play a role in media?

Show up. Work hard. Ask how you can help. Go the extra mile. And never, ever say things like: "That's not in my job description."■

یہ بتائیے کہ آپ کا کام دوسروں کو کیسے متاثر کرتا ہے؟

وائٹنگٹن میں ناقابل یقین حد تک لائق لوگ موجود ہیں اور مجھے وائٹنگٹن کی بہترین خوبیوں کا جشن منانا اچھا لگتا ہے۔ میں نے نائب صدر بائیڈن کی اہلیہ ڈاکٹر جیل بائیڈن کا انٹرویو لیا اور ان کی تصویر سدرق کی زینت بنی۔ وہ نہ صرف ورجینیا کی کوئی کالج میں ہفتے میں دو دن پڑھاتی ہیں بلکہ فوجیوں کے اہل خانہ کی دیکھ بھال اور تعلیم کے فروغ کے لئے ہمد تن مصروف رہتی ہیں۔ افریقہ میں ہاشمی دانت کی خاطر ہاشمیوں کے چوری چھپے شکار کے بحران کے بارے میں میرے چیلسی کانٹن سے لئے جانے والے انٹرویو پر لوگوں کی بڑی تعداد نے بہت مثبت رد عمل دیا ہے۔ چیلسی اور ان کی والدہ ہیلری کانٹن نے ہاشمیوں کے غیر قانونی شکار کے خلاف اور ان کی نسل بچانے کے لئے بہت بڑے پیمانے پر ہم چلائی ہے۔ یہ انٹرویو ہماری بنیادی نئی نئی Niche کے زیر اہتمام چھپنے والے بارہ جلدوں میں بیک وقت شائع ہوا ہے۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ہم اچھی باتیں پھیلا رہے ہیں۔ میں ان دونوں انٹرویو کو ذرائع ابلاغ میں اپنی سب سے بڑی کامیابی گردانتی ہوں۔

آپ امریکی ثقافت اور یا امریکی داستان گوئی کے اسلوب اور خدو خال کو کیسے ترتیب دینا چاہیں گی؟ وائٹنگٹن بہت سی وجوہات کی بناء پر امریکہ کا سب سے اہم شہر ہے۔ ہمارے جریدہ کو یہ خیال رکھتے ہوئے تیار کیا جاتا ہے کہ یہ وائٹ ہاؤس، کینیڈیل ہل اور تمام سفارت خانوں میں جا رہا ہے۔ اس لئے مجھے اُمید ہے کہ خیراتی اُمور، وائٹنگٹن میں نئی ثقافتی دلچسپوں، تجارت، غیر منافع بخش سرگرمیوں اور عوامی خدمات کے شعبوں میں نئے اُبھرنے والے چہروں کے بارے میں ہماری تحریریں ہمارے فکری راہنماؤں کی نظروں سے گزرتے ہیں۔

آج کل کے ماحول میں ذرائع ابلاغ میں کام کرنے میں کون سے عام چیلنج درپیش ہوتے ہیں؟ ہمارے مالی وسائل بہت زیادہ نہیں ہیں اور ہمارا عملہ بہت سادہ اور فعال ہے۔ چھپنے والی ہر شے آن لائن میڈیا اور چوہیں گھنٹے خبروں کی کوریج کی وجہ سے کڑی گرانے میں رہتی ہے۔ بڑے پیمانے پر چھپنے والے رسائل کا ایک اور مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کو تین چار ماہ پہلے سے منصوبہ بندی کرنا ہوتی ہے۔ اس وقت بھی ہم اپنے مئی کے شمارے پر کام کر رہے ہیں جو اپریل کے آخر تک شائع ہوگا۔

کیا آپ کے خیال میں خاتون ہونے کے ناطے آپ کا کام متاثر ہوتا ہے؟ اگر نہیں ہوتا تو کیوں اور اگر ہوتا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟ میرا خیال ہے کہ خاتون ہونے کے ناطے میرا کام مثبت طور پر متاثر ہوتا ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ خواتین بیک وقت کئی کام بخوبی نبھالیتی ہیں۔ انہیں ترجیحات متعین کرنے میں بھی کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ کینیڈیل فائل مکمل طور پر خواتین کا دفتر ہے۔

ذرائع ابلاغ میں کام کرنے کی خواہش مند دیگر لڑکیوں کو آپ کیا مشورہ دینا چاہیں گی؟ اپنا آپ منوا لیں، سخت محنت کریں، پوچھیں کہ آپ کیسے مدد کر سکتی ہیں۔ کام کو بہترین انداز میں سرانجام دینے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ کبھی بھی یہ نہ کہیں کہ "یہ تو میرے فرائض میں شامل نہیں۔"■

TOWARD THE FRONTLINES

محاذوں کی طرف رواں دواں

By Shehla Rizwan

Media and Communications Expert, Pakistan

تحریر: شہلا رضوان، ماہر میڈیا و ابلاغ



Pakistan is a country that has a story around every corner just waiting to be told and women, by default, are great storytellers. Unfortunately in Pakistan, women in media have remained a symbol of attraction, not knowledge. Even those who are more educated and come from liberal families face opposition from their community, as if this were a notorious profession.

Having that in mind, I started writing for newspapers when I was in high school, tried my luck at electronic media in the 90's, and then joined State television as a morning anchorperson. The purpose of the morning show was to inform and educate the general public, and going live on television each day gave me the strength to stand up and raise my voice. I was a morning TV host for six years, and then I decided to do something more challenging, so I switched to Current Affairs and began hosting live shows where the topics of discussion were more hard-core issues like economics and politics. Current Affairs programs in Pakistan have a great impact on politics, social values, life styles, relationships and foreign policy. As a result, anchors of current affairs programs have the power to shape and reshape public opinion. Managing interviews with politicians on a state-run channel used to be difficult for me, especially when we were asked to keep our discussion within certain political boundaries. But now, with the existence of several different television channels, the situation has changed. State channels recognize that they should also have an open policy towards discussion for the sake of fairness. With that change came many new female faces, which in turn gave male anchors some healthy competition.

In our culture, which can be highly conservative and judgmental towards women, it is hard not to feel judged. Sometimes, people think that because you are a female, you are incapable of understanding hard core issues. There are times when men actually spoon-feed you stories and times when sources hesitate to share information with women because they think we are incapable of handling information in the right way. I've even faced situations during live shows when my male co-hosts interrupt me and barge in on my questioning, but the journey continues.

Today it is an established fact that females are an integral part of the Pakistani media. Professionally, they match their male colleagues, even as unfavorable work environments, low salaries, downsizing, and the lack of job security in a majority of media organizations continue to serve as obstacles to women journalists. Moreover their analytical, investigative and empathetic skills are quite impressive as they successfully highlight human angles that have previously been neglected. These vibrant, motivated female anchors and reporters have been a valuable addition to Pakistani media and will soon serve at the frontlines of Pakistani media. ■

پاکستان ایک ایسا ملک ہے جہاں ہر کونے میں ایک کہانی چھپی ہوئی اس انتظار میں ہے کہ کوئی اسے سنانے والا ہو۔ اور خواتین اپنی افتخار کے باعث بہترین کہانی سنانے والی ہوتی ہیں۔ بد قسمتی سے پاکستان کے ذرائع ابلاغ میں کام کرنے والی خواتین کو علم کی نہیں بلکہ پرکشش ہونے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جو خواتین تعلیم یافتہ اور آزاد خیال گھرانوں سے آئی ہیں انہیں بھی اپنی برادری کی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جیسے یہ کوئی بدنام پیشہ ہو۔

یہ ساری باتیں ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے اخبارات میں لکھنا اُس وقت شروع کیا جب میں ہائی اسکول میں پڑھ رہی تھی۔ پھر 1990ء کے عشرے میں انٹیکنک میڈیا میں قسمت آزمائی کی اور بعد میں سرکاری ٹیلی ویژن پر صبح کے پروگرام کی میزبان بن گئی۔ اس صبح کے پروگرام کا مقصد عام لوگوں کو تعلیم دینا اور اُن کی معلومات میں اضافہ کرنا تھا۔ ہر روز ٹیلی ویژن پر لائیو پروگرام کرنے سے مجھے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر آواز اٹھانے کا حوصلہ ملا۔ میں چھ برس تک صبح کے پروگرام کی میزبان رہی۔ پھر میں نے زیادہ مشکل کام کرنے کی ٹھانی اور حالات حاضرہ کا رخ کیا۔ جہاں میں نے معیشت اور سیاست جیسے پیچیدہ موضوعات پر مباحثہ کے پروگراموں کی میزبانی کی۔ پاکستان میں حالات حاضرہ کے پروگرام سیاست، سماجی اقدار طرز زندگی، تعلقات اور خارجہ پالیسی پر بہت اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حالات حاضرہ کے پروگراموں کی میزبان رائے عامہ بنانے اور اسے تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ سرکاری چینل پر سیاستدانوں کے انٹرویو کرنا میرے لئے خاصا مشکل تھا۔ یہ دہشتاوری اُس وقت اور بھی بڑھ جاتی تھی جب ہم سے یہ کہا جاتا تھا کہ اپنی گفتگو کو مخصوص سیاسی حدود کے اندر رکھیں۔ لیکن اب بہت سے مختلف چینلوں کی موجودگی میں صورتحال بدل چکی ہے۔ سرکاری چینل اس حقیقت کو تسلیم کر چکے ہیں کہ غیر جانبداری کا تقاضہ یہ ہے کہ انہیں بحث مباحثے کے دوران میں آزادانہ پالیسی اپنانا ہوگی۔ اس تبدیلی کی وجہ سے کئی نئی خواتین بھی اس شعبے میں آئیں۔ جنہوں نے مرد میزبانوں کے لئے سخت مقابلے کی فضا پیدا کی۔

ہمارا معاشرہ بڑی حد تک قدامت پسند اور خواتین کے بارے میں اپنے من مانے فیصلے صادر کرنے والا ہے۔ اس لئے خواتین پر ہر وقت امتحان کی حالت میں رہنے کا احساس غالب رہتا ہے۔ کبھی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ آپ ایک خاتون ہیں اس لئے آپ پیچیدہ مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ مرد ہمیں گھڑی گھرائی کہانیاں سناتے ہیں۔ اور بعض اوقات تو ذرائع خواتین کو خبریں اور معلومات دینے سے اس لئے احتراز کرتے ہیں کہ وہ انہیں صحیح طور پر سمجھ سکیں۔ مجھے لائیو پروگرام کے دوران میں ایسی صورت حال کا بھی سامنا کرنا پڑا جب میرے ساتھی مرد میزبان نے مداخلت کر کے میرے منہ سے سوالات چھینے۔ لیکن بہر حال سفر جاری رہا۔

آج یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ خواتین پاکستانی ذرائع ابلاغ کا جزو لا ینفک ہیں۔ ذرائع ابلاغ کے زیادہ تر اداروں میں نامساعد حالات کار، کم معاوضوں، چھانینوں، ملازمت کے عدم تحفظ جیسی رکاوٹوں کے باوجود صحافت سے وابستہ خواتین پیشہ وارانہ اعتبار سے اپنے مرد ساتھیوں کے ہم پلہ ہیں۔ مزید برآں یہ خواتین تجزیہ کرنے، تحقیقاتی رویہ اپنانے اور زیر بحث موضوعات کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی متاثر کن صلاحیتوں کی مالک ہیں کیونکہ یہ ایسے انسانی پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں کامیاب رہی ہیں جو پہلے نظر انداز کئے جاتے تھے۔ یہ متحرک، جاندار اور جوش و جذبہ سے بھر پور خواتین میزبان اور رپورٹرز پاکستانی ذرائع ابلاغ میں قابل قدر اضافہ ہیں اور بہت جلد یہ پاکستانی ذرائع ابلاغ کے اگلے محاذوں پر مصروف عمل دکھائی دیں گی۔ ■

DON'T WAIT FOR ANYONE'S PERMISSION

Interview with Charla Lauriston, New York City Stand-up Comedian and Sitcom writer, U.S.



Please describe your role in media. Include a description of how your work gets done on a daily basis.

I'm a stand-up comedian based in New York and a writer for the upcoming Tina Fey produced comedy, "Unbreakable Kimmy Schmidt" I've been listed as one of eight "Black Women Ready for Saturday Night Live" by Essence Magazine, was "Joke of the Week" in TimeOut New York, was featured on MTV (Other)'s Truth or Dare,

have performed stand-up and at the New York Comedy Festival, the She-Devil Festival, and the Chicago Women's Funny Festival.

I've spoken at the Brown University Comedy Conference, and I'm still very proud to have been the commencement speaker for their undergraduate class. I created the critically acclaimed web series Clench & Release, and I perform stand-up comedy all over the country.

I write jokes every day, and perform them as often as possible. As a TV writer, I, along with a group of writers, come up with episodes, and then try our best to make the dialogue as funny as possible.

How did you come into this role? (Life long dream? Educational background? Career switch?)

I moved to New York City in 2010 because I'd always had a feeling that I should live in New York. I got a job working in Senator Gillibrand's NYC office as a staff assistant and randomly started taking improv classes at night to make friends, come out of my shell, and get to know the city. I loved improv so much that I wanted to see how far I could go if I took it seriously. The rest is history.

کسی کی اجازت کا انتظار نہ کریں:

نیویارک شہر کی مزاحیہ فنکار اور ڈرامہ نگار

کارلا لورسٹن سے انٹرویو

ازراہ کرم ذرائع ابلاغ میں اپنے کردار پر روشنی ڈالنے اور بتائیں کہ آپ روزمرہ کا کام کیسے نمٹاتی ہیں؟

میں نیویارک کی رہنے والی ایک مزاحیہ فنکار ہوں اور ٹینا فرے کا تیار کردہ مزاحیہ پروگرام "Unbreakable Kimmy Schmidt" میں نے لکھا ہے۔ Essence Magazine نے مجھے ان آٹھ سیاہ فام خواتین میں شامل کیا ہے جو ہفتے کی شب لائیو پروگرام کے لئے ہمہ وقت تیار رہتی ہوں۔ میں پروگرام New York TimeOut میں "Joke of the Week" ایم ٹی وی پر (Other's Truth or Dare) نیویارک کامیڈی فیسٹول میں، She Devil Festival اور شیکاگو وومنز فیسٹول میں کام کر چکی ہوں۔

میں براؤن یونیورسٹی کی کامیڈی کانفرنس سے بھی خطاب کر چکی ہوں۔ اور مجھے فخر ہے کہ میں ان کی انڈرگریجویٹ کلاس کی پہلی مقررہ تھی۔ میں نے ویب کے لئے سلسلے دار مزاحیہ پروگرام Clench and Release تیار کیا ہے جسے بے حد پسند کیا جا رہا ہے۔ اور میں پورے ملک میں اپنے فن کا مظاہرہ کر چکی ہوں۔

میں روزانہ کی بنیاد پر لکھتی ہوں۔ اور جہاں تک ممکن ہو سکے ان کو عملی طور پر پیش کرتی ہوں۔ ٹیلی ویژن پر ایک مصنف کی حیثیت سے میں دیگر مصنفین کے ایک گروپ کے ساتھ مل کر ایک پروگرام لکھتی ہوں اور پھر ہم کوشش کرتے ہیں کہ یہ ڈائیلاگ زیادہ سے زیادہ مزاحیہ ہو سکیں۔

آپ نے یہ کام کیسے اپنایا؟ (کیا یہ آپ کی دلی خواہش تھا؟ آپ کا تعلیمی پس منظر اسی کا تھا؟ یا آپ نے اپنا پیشہ خود تبدیل کیا؟)

میں 2010ء میں نیویارک منتقل ہوئی کیونکہ میرا ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ مجھے اس شہر میں رہنا چاہیے۔ مجھے سینئر گلبر انڈ کے نیویارک دفتر میں سٹاف اسٹنٹ کے عہدے پر ملازمت ملی۔ اور میں نے وقت گزاری اور اپنی شخصیت کو بہتر بنانے کے لئے کچھ کلاسز میں شرکت کی۔ کیونکہ میں اپنے خول سے باہر آنا، نئے دوست بنانا اور شہر کو اچھی طرح سے جاننا چاہتی تھی۔ میں ان کلاسز کو بہت پسند کرنے لگی اور میں نے سوچا کہ اگر میں سنجیدگی سے سیکھوں تو میں کہاں تک آگے جاسکتی ہوں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔

یہ بتائیں کہ آپ کا کام دوسروں کو کیسے متاثر کرتا ہے؟

مجھے طلبہ سے خطاب کرنے اور انہیں اپنا کیریئر چننے میں مشورے دینے کے مواقع ملے ہیں۔ اس سے پہلے میں نے نوجوان تاجروں سے خطاب کیا اور انہیں ناکام ہونے کے فوائد سے آگاہ کیا۔ مجھے اپنے کام سے عشق ہے۔ مجھے اس



بات پہ خوشی ہوتی ہے کہ میں لوگوں کو متاثر کر سکوں اور انہیں اپنے خواب پورے کرنے کے قابل بنانے میں مدد دے سکوں۔ میرا خیال ہے کہ مزاح کے ذریعے کسی کو اپنا کیریئر بناتے ہوئے دیکھنے سے لوگوں کو اپنی پسند کی راہ اختیار کا حوصلہ ملتا ہے۔ مزاح خصوصاً کھڑے ہو کر مزاح پر فارم کرنے کا اپنا ایک لطف ہے۔ مجھے ہمیشہ وہ مزاحیہ فنکار اچھے لگتے ہیں جو مجھے کسی کام یا بات کے ایسے پہلوؤں سے متعارف کراتے ہیں جن کے بارے میں، میں نے پہلے کبھی نہیں سوچا ہوتا۔ میں بھی اپنے کام میں ایسا ہی کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔

Describe how you feel your work impacts others.

I was given the opportunity to speak to students and give them career advice. Before that, I spoke to young entrepreneurs and gave them advice on the benefits of failure. I love what I do. I love being able to inspire other people and give them the tools to pursue what they want. I think that watching someone make a career out of comedy really encourages others to go after whatever it is they might want. Comedy, particularly stand-up comedy, also has an analytical aspect to it. I always enjoy comedians that make me think, that introduce a perspective I hadn't thought of before. I strive to do that in my work.

What do you feel is your greatest accomplishment working in media so far?

Nothing compares to having an idea and a vision then seeing it come to life the way it did with my web series, Clench & Release. It's been a true challenge but deeply gratifying to see it spread the way it has.

How does what you do shape the American narrative and/or shape American culture?

Comedy is so important socially. Not just for person to person interactions, but humor, especially in America, is a deeply respected and highly regarded art. Comedians host the White House Correspondents Dinner, and comics like George Carlin and Chris Rock, along with many others are considered some of the most important social commentators ever. The American narrative is all about self-determination and comedy is one of the few professions that absolutely requires originality and individuality.

What are the general challenges of working in the media environment today?

The personal challenges I've faced mostly have to do with the barrier to entry for doing comedy professionally. It takes a lot of struggle and sacrifice and years with no pay before any comedian is usually ready to be paid to perform or write comedy.

Do you believe that being a woman affects your work? Why or why not?

It affects my worldview so yes, all of my jokes and my perspective are all born from experiencing the world as a black woman. In the end, however, it doesn't matter what I am if I'm not funny.

What is your advice to other young women eager to play a role in media?

Don't wait for anyone's permission. You belong there because you want to be there. Don't wait until you think you're ready. You're ready because you want it. Go for it. ■

میڈیا میں کام کرتے ہوئے آپ اب تک کس کام کو اپنی سب سے بڑی کامیابی سمجھتی ہیں؟

خیال اور تصور سے لے کر عملی صورت اختیار کرنے تک کے عمل میں ویب پر میرے کھیل "Clench and Release" کا مقابلہ کسی سے نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک بڑا چیلنج تھا۔ لیکن اس کی مقبولیت کو دیکھ کر بہت اطمینان ہوتا ہے۔

آپ امریکی ثقافت اور یا امریکی داستان گوئی کے اسلوب اور خدو خال کو کیسے ترتیب دینا چاہیں گی؟

سماجی اعتبار سے مزاح بہت اہمیت رکھتا ہے۔ امریکہ میں مزاح کو محض ایک فرد کا دوسرے فرد کے ساتھ باہمی تعامل نہیں بلکہ انتہائی قابل احترام فن سمجھا جاتا ہے۔ مزاحیہ فنکار وائٹ ہاؤس کی کوریج کرنے والے نمائندوں کے اعزاز میں دیئے جانے والے عشائیے میں میزبانی کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ جارج کارلین اور کرس راک سمیت کئی دوسرے مزاحیہ فنکاروں کو اہم ترین سماجی تبصرہ نگار سمجھا جاتا ہے۔ امریکی داستان گوئی کا اسلوب مکمل طور پر خود ارادی ہے۔ اور مزاح بھی ان چند پیشوں میں سے ایک ہے جن میں انفرادیت اور اصل پن کا ہونا لازم ہے۔

آج کل کے ماحول میں ذرائع ابلاغ میں کام کرنے میں کون سے عام چیلنج درپیش ہوتے ہیں؟

مجھے ذاتی طور پر اس وقت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جب میں پیشہ ورانہ طور پر مزاحیہ فنکار کے طور پر اس شعبے میں داخل ہو رہی تھی۔ کسی مزاحیہ فنکار یا لکھاری کو برسوں بغیر کسی معاوضے کے سخت محنت کرنا اور قربانیاں دینا پڑتی ہیں جب تا کہ وہ اس قابل ہوتا ہے کہ اپنی خدمات کا معاوضہ وصول کر سکے۔

کیا آپ کے خیال میں خاتون ہونے کے ناطے آپ کا کام متاثر ہوتا ہے؟ اگر نہیں ہوتا تو کیوں اور اگر ہوتا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟

یقیناً کیونکہ میرے تمام لطیفے دنیا کو ایک سیاہ فام خاتون ہونے کی حیثیت سے برتنے اور اسی کے پس منظر میں دیکھنے کے نتیجے میں وجود میں آتے ہیں۔ تاہم اگر میں مزاح نہیں پیدا کر سکتی تو پھر اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ میں کون ہوں۔

ذرائع ابلاغ میں کام کرنے کی خواہش مند دیگر نوجوان خواتین کو آپ کیا مشورہ دینا چاہیں گی؟

کسی کی اجازت کا انتظار نہ کریں۔ یہی آپ کا شعبہ ہے کیونکہ آپ اس میں آنا چاہتی ہیں۔ اس خیال کا بھی انتظار نہ کیجئے کہ آپ ابھی تیار نہیں ہیں۔ آپ بالکل تیار ہیں کیونکہ آپ کچھ کرنے کی خواہش مند ہیں۔ آگے بڑھیے اور کر کے دکھائیے۔ ■



GIVING A VOICE TO THE **VOICELESS**

*Interview with Sadia Shah
Dawn Staff Reporter, Pakistan*

Please describe your role in media.
Include a description of how your work
gets done on a daily basis.

I work as a staff reporter with Dawn Daily Newspaper and have also been working with Voice of America's Deewa Radio for the past few years. I report on different issues relating to education, women's rights/human rights, political developments and any issue that interests me. I report at various press conferences, but I also

بے زبانوں کی ترجمانی کرنا

سٹاف رپورٹر روزنامہ ڈان، سعدیہ شاہ سے انٹرویو

ہیں اس لئے میں محسوس کرتی ہوں کہ صحافی ہونے کے ناطے ہم نگرانی کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ میں نہ صرف خبریں دیتی ہوں بلکہ ان کا تجزیہ بھی کرتی ہوں تاکہ اپنے قارئین کو تازہ ترین حالات کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ رکھ سکوں۔ میں وائس آف امریکہ کے لئے رپورٹنگ کرتے وقت بھی یہی کچھ مقامی زبان میں کرتی ہوں۔ کیونکہ ہمارے سامعین کی بہت بڑی تعداد افغانستان کے دیہی اور قبائلی علاقوں میں رہتی ہے۔

آپ نے یہ کام کیسے اپنایا؟ (کیا یہ آپ کی دلی خواہش تھی، آپ کا تعلیمی پس منظر اسی کا تھا، یا آپ نے اپنا پیشہ خود تبدیل کیا؟)

investigate issues that involve rights' violations which need to be brought to the attention of authorities and the public. Because we are looking at developments and issues with a transparent lens and highlighting the realities, I feel as though our work as journalists is more like being watchdogs. I not only report, but also analyze stories to make my readers aware of different aspects of a current issue. I do the same while reporting for VOA radio, but I do so in vernacular language since a large number of our listeners are villagers from Afghanistan and the Tribal areas.

How did you come into this role? (Life long dream? Educational background? Career switch?)

I took on this profession by choice and by chance. Initially I took an internship in Daily Dawn just to pass the time in the evenings, as I had just finished my Master's Degree in English Literature and was teaching at Army Public School (the same college recently brutally attacked by militants). I found that I enjoyed meeting people and talking to them about different issues while also giving them a voice through my reports in the daily newspaper. I found more satisfaction in journalism than teaching. It was as if I had found my passion. It was not a well-paid job a decade ago. I had to live in a horrible hostel which lacked facilities, I used public transportation and faced a lot of harassment, but my work still gave me happiness. It broadened my understanding of various issues relating to the people. I did not study journalism in school but learnt it through practical experience. In fact, it is an ongoing learning experience. I enjoy my work thoroughly and couldn't have dreamt of anything more satisfying than this. I had many opportunities to switch careers (the low salaries made things particularly difficult) but in the end I took on the challenge to go on with journalism and it is paying off well in every way.

Describe how you feel your work impacts others.

I feel my work gives a voice to the voiceless. In my radio reports I not only give a voice to the those who have been unheard, for example women and children, but I also try to create awareness by sharing information on issues which very much relate to the common man. In addition to my work, I feel that my presence in media can also have an impact on those men and women who hesitate to take up this profession or who feel that women can't work in media, especially in Khyber Pakhtunkhwa. There are still very few women in print media and I guess the nature of this job, as well as the work benefits are not enough to encourage women into media. Despite such problems, I have managed and I am doing quite well so I send out a message to others that one can do this if one really wants. There is nothing to stop you except you yourself.

What do you feel is your greatest accomplishment working in media so far?

If I make even a little difference in someone's life, someone's thinking or understanding regarding some issue through my reports

ہیں اس لئے میں محسوس کرتی ہوں کہ صحافی ہونے کے ناطے ہم نگرانی کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ میں نہ صرف خبریں دیتی ہوں بلکہ ان کا تجزیہ بھی کرتی ہوں تاکہ اپنے قارئین کو تازہ ترین حالات کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ رکھ سکوں۔ میں وائس آف امریکہ کے لئے رپورٹنگ کرتے وقت بھی یہی کچھ مقامی زبان میں کرتی ہوں۔ کیونکہ ہمارے سامعین کی بہت بڑی تعداد افغانستان کے دیہی اور قبائلی علاقوں میں رہتی ہے۔

آپ نے یہ کام کیسے اپنایا؟ (کیا یہ آپ کی دلی خواہش تھی، آپ کا تعلیمی پس منظر اسی کا تھا، یا آپ نے اپنا پیشہ خود تبدیل کیا؟)

میں نے یہ پیشہ اتفاقاً تین اپنی خواہش پر اپنایا ہے۔ اس کا آغاز یوں ہوا کہ میں نے انگریزی ادبیات میں ماسٹر ڈگری کے بعد شام کا وقت گزارنے کے لئے روزنامہ ڈان میں انٹرن شپ کی تھی۔ اُس وقت میں آرمی پبلک سکول میں پڑھا بھی رہی تھی۔ (یہ وہی سکول ہے جہاں حال ہی میں دہشت گردوں نے خون ریز حملہ کیا تھا) میں نے یہ محسوس کیا کہ مجھے لوگوں سے ملنا اور ان سے مختلف مسائل پر بات کرنا اچھا لگتا ہے۔ جبکہ میں روزانہ اخبار میں اپنی رپورٹوں کے ذریعے ان کی ترجمانی بھی کر رہی ہوں۔ مجھے پڑھانے سے زیادہ صحافت میں اطمینان محسوس ہونے لگا۔ یہ بالکل ایسے تھا جیسے مجھے اپنا شوق پورا کرنے کا موقعہ میسر آ گیا ہے۔ عشرہ بھر پہلے تنخواہ کے اعتبار سے یہ کچھ بہت اچھی نوکری نہیں تھی۔ مجھے ایک ایسے ہولناک ہوٹل میں رہنا پڑ رہا تھا جس میں سہولیات نہیں تھیں۔ مجھے پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کرنا پڑتی تھی اور بری طرح ہراساں بھی کیا جاتا تھا۔ لیکن مجھے اپنے کام سے اطمینان ملتا تھا۔ اس سے میں لوگوں سے متعلق معاملات کو بہتر انداز میں سمجھنے کے قابل ہو گئی تھی۔ میں نے کسی تعلیمی ادارے میں صحافت کی تعلیم نہیں پائی لیکن میں نے اس کا تجربہ عملی میدان میں رہتے ہوئے حاصل کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سیکھنے کا ایک مسلسل عمل ہے۔ میں اپنے کام سے بے حد لطف اندوز ہوتی ہوں اور میرا نہیں خیال کہ کوئی اور کام مجھے اس قدر خوشی بہم پہنچا سکتا ہے۔ مجھے اپنا پیشہ تبدیل کرنے کی کئی مواقع ملے (خاص طور پر جب کم تنخواہ کی وجہ سے مشکلات میں اضافہ ہو رہا ہو) لیکن میں نے صحافت میں ڈٹے رہنے کا چننا قبول کیا اور اب مجھے ہر طرح سے مکمل اطمینان ہے۔

یہ بتائیے کہ آپ کا کام دوسروں کو کیسے متاثر کرتا ہے؟

میرا خیال ہے کہ میرا کام ایسے لوگوں کی آواز بن رہا ہے جن کی کوئی نہیں سنتا۔ میں اپنی ریڈیو رپورٹس میں نہ صرف ان ہی لوگوں کو رپکارڈ کرتی ہوں جنہیں کبھی بولنے کا موقع نہیں دیا جاتا مثلاً خواتین اور بچے۔ بلکہ ایسے مسائل کے بارے میں معلومات فراہم کر کے لوگوں کا شعور بیدار کرتی ہوں۔ جو عام لوگوں سے متعلق ہوتے ہیں۔

اپنے اس کام کے علاوہ میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ ذرائع ابلاغ میں میری موجودگی ان لوگوں پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے جن کا یہ خیال ہے کہ خواتین ذرائع ابلاغ میں خاص طور پر نہیں پختونخوا میں کام نہیں کر سکتیں۔ اخباری صنعت میں بہت کم خواتین کام کر رہی ہیں اور میرا یہ اندازہ ہے کہ کام کی نوعیت اور اس سے حاصل ہونے والے فوائد اس قدر نہیں ہیں کہ خواتین کو ذرائع ابلاغ میں کام کرنے کی ترغیب ملے۔ اس طرح کے مسائل کے باوجود میں ڈٹی رہی ہوں اور اب بہت بہتر انداز میں کام کر رہی ہوں۔ اس لئے میں دوسروں کو یہ پیغام دینا چاہوں گی کہ اگر کوئی پختہ ارادہ کر لے تو وہ اس شعبے کا حصہ بن سکتا ہے۔ آپ کو روکنے والا آپ کے اپنے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

میڈیا میں کام کرتے ہوئے آپ اب تک کس کام کو اپنی سب سے بڑی کامیابی سمجھتی ہیں؟

اگر میں اپنی رپورٹس کی وجہ سے کسی کی زندگی میں تھوڑی سی بھی تبدیلی لاسکوں، کسی مسئلے کے حوالے سے ان کی سوچ اور فہم میں بہتری لاسکوں یا کسی ایسے فرد کی آواز آگے پہنچا سکوں جس کو کبھی کسی نے نہ سنا ہو تو میں یہ سمجھوں گی کہ یہ میری سب سے بڑی کامیابی ہے۔

آپ ثقافت اور یا بیانیہ کے اسلوب اور خدو خال کو کیسے ترتیب دینا چاہیں گی؟

یہ حقیقت کہ میں ایک پختون خاتون صحافی ہوں اور میری رپورٹس اس امر کی عکاسی کرتی ہیں کہ ہم سب انتہا پسند نہیں ہیں

or give voice to those unheard before- I feel that is my greatest accomplishment.

How does what you do shape the public narrative and/or shape culture?

My reports, and the fact that I am a Pashtun woman journalist, set an example that all of us are not extremists or people living in the stone-age. People like me struggle every day to shed light on different aspects of Pashtun/Pakistani life which have been hidden away from the world. People like me work and write every day about things which counter the misperceptions about us.

What are the general challenges of working in the media environment today?

The safety of journalists is one of the biggest issues these days. The KP/FATA region is one of the most dangerous regions for journalists, so our work is risky and there are no safety mechanisms.

Do you believe that being a woman affects your work? Why or why not?

Since many of the people are still ignorant of the fact that a woman can be a journalist, it is sometimes hard to talk in an environment with people who have this mentality. Access to information and mobility is a big issue especially being a woman working in a male-dominated society with cultural norms that restrict the movement of women. I have also had experiences that sometimes a woman is not taken as seriously as a journalist. Instead of treating her on merit she is sometimes positively or negatively discriminated against. Things are changing but it's still too slow.

Sometimes it is a blessing because as a woman I can go unnoticed in places where male journalists cannot go. Male journalists find it hard to interview women and I have taken that as an advantage and focused on women issues.

What is your advice to other young women eager to play a role in media?

I have been seeing in recent years young girls joining electronic media (TV channels) as reporters. However, I feel they are in it for the glamour or the money since electronic channels pay well compared to newspapers. There is still a need for more women to come in media and stay long enough to make an impact. There is a need for more professional women in media. It is tough no doubt to stay on in this challenging and male-dominated environment, but I just want to let my young colleagues know that nothing comes easy, but nothing is impossible. ■

اور نہ ہی ہم لوگ پتھر کے زمانے میں رہ رہے ہیں۔ میری طرح کے لوگ ہر روز پشتون اور پاکستانی زندگی کے ایسے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں جو دنیا سے پوشیدہ ہیں۔ مجھ جیسے لوگ روزانہ ایسی چیزوں کے بارے میں لکھتے اور کام کرتے ہیں جن سے ہمارے بارے میں پھیلے ہوئی غلط فہمیوں کو دور کیا جاسکے۔

آج کل کے ماحول میں ذرائع ابلاغ میں کام کرنے میں کون سے عام چیلنج درپیش ہوتے ہیں؟
آج کل صحافیوں کی سلامتی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ خیر بختوں، نوا اور فانا کا علاقہ صحافیوں کے لئے خطرناک علاقوں میں سے ایک ہے۔ ہمارا کام خطرات سے بڑھے اور حفاظت کا کوئی انتظام بھی موجود نہیں ہے۔

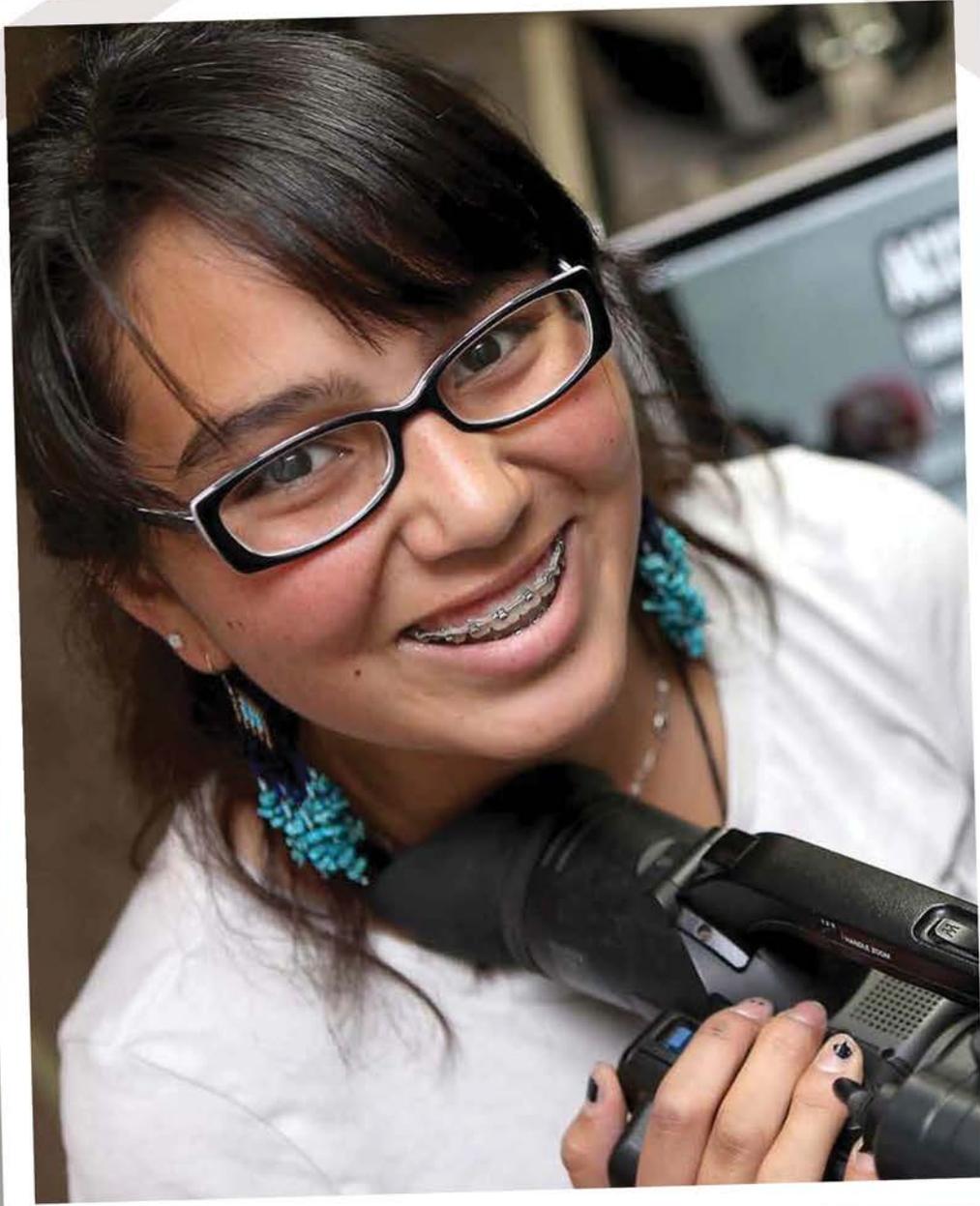
کیا آپ کے خیال میں خاتون ہونے کے ناطے آپ کا کام متاثر ہوتا ہے؟ اگر نہیں ہوتا تو کیوں اور اگر ہوتا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟

چونکہ اب بھی بہت سے لوگ یہ بات نہیں جانتے کہ خواتین بھی صحافی ہو سکتی ہیں اس لئے اس طرح کی ذہنیت رکھنے والے ماحول میں بسا اوقات لوگوں سے بات کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ مردوں کی بالا دستی والے معاشرے میں جہاں ثقافتی اعتبار سے خواتین کی نقل و حرکت بہت محدود ہوتی ہے۔ ایک خاتون صحافی کے لئے گھومنا پھرنا اور معلومات تک رسائی حاصل کرنا خاصا مشکل کام بن جاتا ہے۔ مجھے اس بات کا بھی تجربہ کئی بار ہو چکا ہے کہ ایک خاتون صحافی کو سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا۔ اُس کے ساتھ موزوں برتاؤ کرنے کے بجائے اُس کے ساتھ مثبت یا منفی طور پر امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ اگرچہ صورتحال بدل رہی ہے لیکن تبدیلی کی رفتار بہت سست ہے۔

بعض اوقات ایک خاتون صحافی ہونا میرے لئے فائدہ مند ثابت ہوتا ہے کیونکہ میں ایسی جگہوں پر آسانی سے چلی جاتی ہوں جہاں مرد صحافی نہ جاسکتے ہوں۔ مرد صحافی خواتین کا انٹرویو کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں جبکہ میں اسے اپنی فوجیت سمجھتی ہوں۔ اسی لئے خواتین کے مسائل پر اپنی توجہ منعطف رکھتی ہوں۔

ذرائع ابلاغ میں کام کرنے کی خواہش مند دیگر لڑکیوں کو آپ کیا مشورہ دینا چاہیں گی؟

میں دیکھ رہی ہوں کہ حالیہ برسوں میں نوجوان خواتین بڑی تعداد میں الیکٹرانک میڈیا یعنی ٹیلی ویژن چینلز میں رپورٹری حیثیت سے شامل ہو رہی ہیں۔ تاہم میرا خیال ہے کہ وہ چکا چوند اور سپیے کی خاطر ایسا کر رہی ہیں کیونکہ ٹیلی ویژن چینلز اخبارات کے مقابلے میں اچھی تنخواہ دیتے ہیں۔ اب بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ زیادہ سے زیادہ خواتین ذرائع ابلاغ میں آئیں یہاں ڈٹ کے رہیں اور اپنا آپ ثابت کریں۔ ذرائع ابلاغ میں زیادہ پیشہ ور خواتین کا آنا وقت کا تقاضا ہے۔ اگرچہ مردوں کی بالا دستی والے ماحول میں کام کرنا اور ڈٹ کے رہنا بہت دشوار ہوتا ہے لیکن میں اپنی نوجوان ساتھیوں سے کہنا چاہوں گی کہ کوئی بھی کام آسان نہیں اور نہ ہی ناممکن ہے۔ ■



Long excluded from serious news reportage, women today have risen to the top in media organizations worldwide. Young Navajo Indian filmmaker Camille Manybeads Tso draws inspiration from her ancestor, a warrior named Yellow Woman.

خواتین، جنہیں طویل عرصے تک سنجیدہ خبروں کی رپورٹنگ سے باہر رکھا جاتا رہا، آج دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ میں اعلیٰ مقام حاصل کر چکی ہیں۔ بھارت کی نوجوان نوا جو فلسا زکیمیلی سے بیڈزٹسوا اپنی جد امجد ”میلو وین“ نامی جنگجو سے متاثر ہے۔

